ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری

DR. ZAKIR HUSAIN LIBRARY

JAMIA MILLIA ISLAMIA
JAMIA NAGAR

NEW DELHI

Please examine the book before taking it out. You will be responsible for damages to the book discovered while returning it.

DUE DATE

Cl No. ____________ *Acc. No.* ____________

Late Fine Ordinary books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night book **Re. 1/-** per day.

لکشمی آپ کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے

کم از کم شرح پر زیادہ سے زیادہ حفاظت

اعداد و شمار جو اعتبار و حوصلہ کو بڑھاتے ہیں

۱۹۴۲ء

کل مالیت .... زائد از ۲۲۱ لاکھ روپے

لائف فنڈ .... زائد از ۲۰۳ لاکھ روپے

سالانہ آمدنی زائد از ۴۷ لاکھ روپے

اداشدہ مطالبات ..... زائد از ۶۵ لاکھ روپے

نیا بزنس زائد از ایک کروڑ ۲۵ لاکھ روپے

پچھلے سال کی بہ نسبت کاروبار میں ۲۵٪ کا اضافہ ہوا ہے۔

لکشمی انشورنس کمپنی لمیٹڈ ہیڈ آفس لاہور

برانچیں تمام ہندوستان میں قائم ہیں



ڈونگرے کا بال امرت

کے استعمال سے

بچے طاقتور اور چنگے بنتے ہیں

یہ مشہور دوا ہے

سوزِ ناتمام

دوسرا ایڈیشن

عاشق حسین بٹالوی کے مختصر افسانوں کا مجموعہ اس کا پہلا ایڈیشن دس ماہ کی قلیل مدت میں ختم ہوگیا۔ اہلِ ذوق کے اصرار پر دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا ہے جو پہلے ایڈیشن کے تمام افسانوں کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں ایم اے کے ایک مبسوط مقدمے پر مشتمل ہے۔

سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر روزنامہ بمبئی کرانیکل کی رائے

"بعض افسانوں کے کردار اس قدر دلچسپ ہیں کہ کہانی ختم کرنے پر بھی ان کی شخصیت کا طلسم پڑھنے والے کے دل و دماغ پر طاری رہتا ہے اور انسان چشم پرنم کے ساتھ ان کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہوتا ہے۔ ان کہانیوں کا اہم ترین حصہ وہ ہے جہاں افرادِ قصہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ یہیں مصنف نے اپنی حیرت انگیز دنیا در الکلامی کو کام میں لاکر عہدِ حاضر کے پرپیچ معاملات اور فطرتِ انسانی کے دقیق اسرار کی نقاب کشائی کی ہے۔ طرزِ تحریر میں سلاست اور روانی ہے آورد کا نام و نشان نہیں۔ قیمت ایک روپیہ چار آنہ

مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا لاہور

ضرورت ہے

اور

اس قدر ضرورت کہ سکول فار الیکٹریشنز لدھیانہ کے اکثر ہوشیار طلبہ کو دورانِ تعلیم میں ہی سرکاری ملازمتیں مل جاتی ہیں۔ سکول گورنمنٹ ایڈڈ ہے اور رجسٹرڈ اور جلد روزگار حاصل کرنے کا بہترین حصہ ہے۔ لہٰذا بجلی کا کام سیکھنے والے طلباء جلد درخواستیں بھیجیں۔

پراسپیکٹس مفت

مینیجر

ترجمان حقیقت
حضرت علامہ
اقبال
کی
یاد کو تازہ
رکھنے کے لئے
ان کی بہترین عکسی تصویر
سے اپنے کمرے کی
زینت بڑھایئے
قیمت ایک روپیہ آٹھ
آنے محصول ڈاک
علاوہ پیکنگ معاف
مینیجر کتب خانہ ادبی دنیا
مال روڈ۔ لاہور



(اس شمارہ کے تمام مضامین نظم و نثر کے جملہ حقوق محفوظ ہیں)

مارچ سنہ ۱۹۴۳ء — جلد ۲۱ - نمبر ۳

فہرست مضامین

ایڈیٹر: صلاح الدین احمد، آنریری جائنٹ ایڈیٹر: قیوم نظر

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
۱	بزم ادب	صلاح الدین احمد	۷
	افسانے		
۲	چاندی کے تار	جناب مہندر ناتھ	۲۶
۳	مسکراہٹ	جناب نصیر حیدر	۴۲
	علمی اور ادبی مضامین		
۴	ماہوا	جناب علی احمد بی اے	۹
۵	آرٹ اور حسن	سید علی عباس جلالپوری	۳۷

نمبر شمار	مضمون	صاحب مضمون	صفحہ
	حصہ نظم		
۶	غزل	جناب اثر صہبائی	۸
۷	ہرجائی	جناب طالب شبیرازی	۳۴
۸	سازِ ہندی	جناب فراق گورکھپوری	۲۵
۹	غزل	جناب مسعود شاہد	۳۵
۱۰	انقلاب	جناب یوسف ظفر	۳۶
۱۱	جیوتشی	جناب مخمور جالندھری	۴۱
۱۲	بہار کے دو گیت	قیوم نظر	۴۸
	دنیائے ادب		
۱۳	ایک اور ایک چار	جناب مرزا فرحت اللہ بیگ	۴۹

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ فی پرچہ آٹھ آنے

مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر اینڈ پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

خوش مذاق اصحب کے لئے پسندیدہ تحفہ

روسکو

کا خوشبودار

کسٹرائیل

جو بالوں کو دراز کرتا ہے

اور اپنی بھینی بھینی خوشبو سے

دماغ کو ہر دم تازہ رکھتا ہے





AVAILABLE EVERYWHERE

FRANK ROSS & CO LTD
CALCUTTA

پنجاب ایجنٹس:-
تیرتھ کرشن سہگل لمیٹڈ ۳۶ دی مال لاہور فون نمبر ۲۲۱۳
کناٹ سرکس نیو دہلی فون نمبر ۷۹۳۴

سیریڈان سے درد رک جاتا ہے



کتابوں

اور رسالوں کی خرید و فروخت

ملک اور قوم کی بہترین خدمت

ہے آئیے اور اس خدمت

میں ہمارا ہاتھ بٹائیے

مینیجر کتبخانہ ادبی دنیا

بکنگ کے لئے تیار۔

پرنیما پروڈکشنز کی

سال رواں کی بہترین تصویر

کشور ساہو کا لاجواب شاہکار

راجہ

ہدایت کار کشور ساہو

کہانی کشور ساہو

دل ہلا دینے والے منظر پیش کرنے والی کہانی

خرافات اور بے ہودگیوں سے مبرا

اداکاران :- پرو تما داس گپتا کشور ساہو رانی بالا۔ گلاب۔ موتی چیٹرجی وغیرہ وغیرہ۔

سنٹری بیت مومن سنہا

لاکھوں دلوں کی مالکہ

ممتاز شانتی

کو پیش کرنے کا فخر حاصل کرتے ہیں

بدلتی دنیا

جدید طرز کا ڈرامہ جو نہایت اعلیٰ طریق پر عورت اور مرد کے مساوی حقوق کا آدرش پیش کرتا ہے۔

اداکاران :- ترلوک کپور کے۔ سی۔ ڈے۔ شاہزادی۔ کانتی لال وغیرہ وغیرہ

بکنگ کے لئے لکھئے :-

کاسموپولیٹن اینڈ ربجیس پکچرز لمیٹڈ

چاندنی چوک دہلی

تار کا پتہ دربار (DURBAR)


ہندوستانی چائے میں سب سے بہتر
LIPTONS
WHITE LABEL
TEA
لپٹن کی
جاگو جا سفید لیبل اور ٹی گرل چائے
LTK 52

بزم ادب

ناظرین ادبی دنیا پنجاب اردو کانفرنس کی نامبیں سے واقف ہو چکے ہیں۔ اس کانفرنس کی مجلس عاملہ نے پنجاب میں اردو کے فروغ و تحفظ کے لئے جو تجاویز مرتب کی ہیں۔ ان میں "اردو بولو" کی تحریک ایک نہایت مفید اور نتیجہ خیز تجویز ہے۔ ایک نامزدہ سب کمیٹی جو اساتذہ اور دیگر تجربہ کار اصحاب پر مشتمل ہے آج کل اُن مختلف ذرائع پر غور و خوض کر رہی ہے جو اس تحریک کی توسیع و اشاعت کے لئے موزوں و مناسب ہو سکتے ہیں۔ امید ہے کہ چند روز میں سب کمیٹی کی تجاویز مرتب ہو کر کانفرنس کی مجلس کے سامنے آجائیں گی۔ اور "اردو بولو" کی تحریک ایک ادبی مہم کی صورت میں جاری کر دی جائے گی۔ ادبی دنیا کے جن ناظرین کو کانفرنس کے اس مقصد سے دلچسپی ہو اور ظاہر ہے کہ بیشتر ناظرین کو ہو گی۔ وہ ازراہ کرم اپنے اپنے حلقے میں اس کی اشاعت کی ذمہ داری قبول کریں اور اپنے اس ارادے سے سکرٹری پنجاب اردو کانفرنس کو مطلع کر دیں تاکہ متعلقہ تفصیلات و ہدایات اُن کو جلد از جلد پہنچا دی جائیں۔ پتہ یہ ہے سکرٹری پنجاب اردو کانفرنس متصل دفتر ادبی دنیا۔ مال روڈ لاہور۔

ہم نے کسی گذشتہ شمارے میں اپنے قلمی معاونین کی بادب درخواست کی تھی کہ کاغذ کی نایابی سے جو صورت حالات پیدا ہو گئی ہے اس کا تقاضہ ہے کہ ہم مختصر مضامین کو مفصل اور طویل مضامین پر ترجیح دیں۔ یہ مسلّم ہے کہ بعض مطالب تفصیل کے بغیر خوش اسلوبی سے ادا نہیں ہو سکتے۔ اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ جامعیت بیان کی اہم ترین خوبیوں میں سے ہے لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ مضامین کا تنوع اور رنگارنگی جو ایک ادبی مجلّے کی اہم ترین خصوصیت سمجھی جاتی ہے، موجودہ ضخامت میں جامعیت کا کسی طرح ساتھ نہیں دے سکتی۔ اور ناظرین کا ایک بہت بڑا طبقہ تنوع کو جامعیت سے اہم تر سمجھتا ہے۔ اس لئے ہم مجبور ہیں کہ ایک حد تک اُس کی پسند کا بھی خیال رکھیں۔ اگرچہ غالباً ہم اب تک اس میں چنداں کامیابی حاصل نہیں کر سکے۔ اشاعت زیر نظر میں علی احمد صاحب کا بیش قیمت مضمون "تاہوا" اور مہندر ناتھ صاحب کا دلکش افسانوی خط "چاندی کے تار" ہماری اس کوتاہی کے شاہد ہیں۔ ان دونوں کا انداز فراغت کے دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن ہمیں امید ہے کہ جہاں ان میں سے ہر ایک نے دو دو تین تین مختصر مضامین کی جگہ گھیر رکھی ہے، وہاں ان کی تفصیلات کی دلکشی اختصار کے فوائد سے کچھ کم قیمتی نہیں ہے۔ مہندر ناتھ کا اسلوب بیان روز بروز نکھر رہا ہے اور اگر یہ نوجوان مصنف ذریعۂ اظہار پر بھی اسی طرح توجہ کرتا رہا جس طرح وہ تجزیۂ مطالب پر کرتا ہے تو اُس کی تخلیقات اپنی ان خصوصیات کے لحاظ سے بہت جلد منفرد ہو جائیں گی۔

ہمارے ایک اور نوجوان افسانہ نگار سید علی عباس جلال پوری ایک عرصۂ دراز کے بعد ہماری بزم میں شریک ہوئے ہیں لیکن اس دفعہ وہ انھیں بدل کر آئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جس قدر افسانے اب تک لکھے ہیں وہ ذاتی واردات اور تجربات کا نتیجہ تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قابل ذکر ذاتی تجربے روز روز پیش نہیں آتے اس لئے انہوں نے افسانہ نویسی فی الحال ملتوی کر دی ہے۔ اگرچہ ہم اُن کا یہ عذر قبول کرنے میں متأمل ہیں لیکن چونکہ وہ چیز جو انہوں نے افسانے کے بدلے عنایت فرمائی ہے، بجائے خود نہایت دلکش، خیال افروز اور مفید ہے۔ اس لئے ہم ان کا مقالہ "حسن اور آرٹ" بھی اسی مسرت سے شائع کر رہے ہیں جس مسرت سے ہم اُن کے افسانے شائع کیا کرتے تھے۔ یہ مقالہ آرٹ پر ایک سلسلۂ مضامین کی پہلی کڑی ہے اور ہمیں امید ہے کہ ناظرین آرٹ جیسے اہم اور دقیق موضوع پر اس طرز کے سلیس اور واضح مضامین کی پوری قدر کریں گے۔

صلاح الدین احمد

غزل

کیا واسطہ ہے ان کو فنا و بقا کے ساتھ
وابستہ ہو چکے ہیں جو تیری رضا کے ساتھ

جاؤ نہ اب ستاؤ ہمیں اے بتو! کہ ہم
پیمانِ عشق باندھ چکے ہیں خدا کے ساتھ

کیا ہے دعا؟ دعا کا اثر کیا ہے؟ کیا کہوں
جاتا ہوں خود بھی عرش پہ اپنی دعا کے ساتھ

تیرے طفیل مجھ کو ملا یہ مقامِ شوق
رہتا ہے تیرا ذکر بھی ذکرِ خدا کے ساتھ

نا آشنائے دیر و حرم ہے مری جبیں
اس کو ہے ربطِ شوق ترے نقشِ پا کے ساتھ

اتنا ہی ہے کہ اس کو خدا مانتا نہیں
چشمک نہیں ہے ورنہ مجھے ناخدا کے ساتھ

تیری سمجھ میں آ نہ سکیں گے رموزِ عشق
صحبت نہیں تجھے کسی مردِ خدا کے ساتھ

ارہ کہیں ہے نار کہیں دار ہے کہیں
اٹکھیلیاں عجیب ہیں اہلِ وفا کے ساتھ

عشق اور صبر! سخت کٹھن ہے، مگر اثرؔ
منزل اگر کٹے گی تو صبر و رضا کے ساتھ

اثرؔ صہبائی

ماہوا

مشرقی بنگال کا ایک گیت

قبل اس کے کہ گیت کا آغاز کیا جائے اور اس کی خوبیوں کے متعلق کوئی بحث چھیڑی جائے۔ مشرقی بنگال کی سیاسی اور تہذیبی تاریخ کی ایک مختصر تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ حصہ مائی منسنگھ کہلاتا ہے اور یہاں سے ہمیں دیہاتی ادب کے بہترین نمونے حاصل ہوئے ہیں۔ مائی منسنگھ کا مشرقی حصہ دراصل پراگ جوتشپور کی پوری قلمرو پر مشتمل ہے جو چوتھی صدی قبل مسیح میں گپت راجاؤں کے زیر حکومت تھا بعد ازاں پال راجاؤں کے زمانہ آخر میں جب مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی تو پراگ جوتشپور رفتہ رفتہ اس بڑی قلمرو سے علیحدہ ہوتا گیا یہاں تک کہ اُسے کامل سیاسی خود مختاری حاصل ہو گئی۔

تب سین راجاؤں نے اپنی فتوحات کے ساتھ سارے ملک کو برہمنیت میں تبدیل کر دینے کی کوشش کی لیکن مشرقی مائی منسنگھ ایک بڑی مدت تک پراگ جوتشپور راج کے ساتھ حق وفاداری بجا لاتا رہا تیرھویں صدی میں جب آخر الذکر حکومت زوال پذیر ہوئی تو یہ علاقہ مختلف چھوٹی چھوٹی خود مختار حکومتوں میں منقسم ہو گیا یہ سارے حکمران راج بنسی تھے جنہیں ہندو عام طور پر کرات کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

شمال میں نیم آریائی جماعت کا ایک سردار دیبیا گار تیرھویں صدی تک حکومت کرتا رہا یہاں تک کہ سوسوار نامی ایک برہمن سردار نے اس کو شکست دی اور خود قابض ہو گیا۔ سوسنگ درگاپور کے موجودہ مہاراجوں کے خاندان کا بانی بھی برہمن سوسوار تھا۔ یہ ۱۲۸۰ء میں قنوج سے آیا تھا۔ سوسنگ دریا کو ہمارے اسی فاتح برہمن کے نام سے آج تک موسوم ہے۔ شیرپور کے قریب دوسرا راج بنسی سردار دلیپ سینا پندرھویں صدی میں حکمران تھا۔ اس کے قلعہ کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ انہیں جریپ کہتے ہیں جو دلیپ سے بگڑا ہوا لفظ ہے آخری راج بنسی سردار فیروز شاہ کے ایک سپہ سالار ہمایوں کے ہاتھوں ۱۴۹۱ء میں قتل ہوا۔ مسلمانوں نے اس مشرقی مائی منسنگھ کا نام معظم آباد کیا جس کے حدود سلہٹ میں لاؤڑ تک پہنچتے تھے ۱۵۱۲ء میں حسین شاہ نے اسے مکمل طور پر فتح کر لیا۔ متذکرہ بالا بیان سے یہ صاف طور پر ظاہر ہے کہ پورا مشرقی مائی منسنگھ راج بنسیوں اور دوسرے ایسے فرقوں کے زیرنگیں رہا جن کی تہذیب اور معاشرت اُس برہمن مت سے بالکل مختلف تھی جسے سین راجاؤں نے پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ نیم آریائی فرقے طاقتور اور امن پسند تھے۔ نیز وہ آرٹ اور ادب سے دلچسپی رکھتے تھے۔

مشرقی بنگال کی اس مجمل سیاسی تاریخ سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ یہاں کی تہذیب برہمنیت سے بالکل متاثر نہیں ہوئی بلکہ مخالف ہی رہی۔ سین راجاؤں نے قنوج کے برہمنوں کے ذریعے دیوتاؤں کی پرستش کا جو نظریہ پیش کیا اُس میں "کرم" یعنی عمل کا فقدان تھا۔ برہمنوں نے "گوری دان" یعنی لڑکیوں کی شادی کے یہ اصول بنائے کہ آٹھ سال کے اندر وہ بیاہ کی بندشوں میں جکڑ دی جائیں تاکہ وہ آئندہ اپنا پتی خود پسند کرنے سے محروم رہیں۔

لیکن جب ہم زیر بحث "ماہوا" گیت یا اس علاقہ کے دوسرے گیتوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو یہاں کی فضا کو بالکل مختلف پاتے ہیں اور اس ہندو تہذیب کا صحیح نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے جبکہ برہمن مذہبی معاملات میں دخیل نہ تھے اور ان کے

عروج کا زمانہ بہت دور تھا عورت خود اپنا شوہر پسند کرتی ہے اور اُس وقت تک بیاہ نہیں کرتی جب تک وہ جوان نہیں ہو جاتی چنانچہ ہمارے گیت کی ہیروئن ماہوا نادرچند کے عشق میں اس وقت گرفتار ہوتی ہے جب وہ سولہ سال کی دوشیزہ ہے

یہ رومانی گیت ماہوا غنائی نظم کے قطع نظر میلوڈراما کی طرز میں لکھا گیا ہے اور ۷۵۵ مصرعوں پر مشتمل ہے۔

مشرقی مائی منسنگ کی ایک روایت کے بموجب اس گیت کا مصنف دویجا کنھائی ہے یہ ناما سدر اذات کا پروہت تھا جس کا زمانہ ۳۰۰ سال قبل کا بتایا جاتا ہے۔ دویجا کنھائی کے متعلق یہ مشہور ہے کہ وہ ناماسدر اذات کی ایک عورت سے محبت کرتا تھا جو اس سے کم درجہ کی تھی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس پرستارانہ محبت کی راہ میں خود مصنف شاعر کو وہ تمام سختیاں جھیلنی پڑیں جو گیت کے ہیرو نادرچند سے منسوب کی گئی ہیں۔ اس پریم کتھا کی مزید تفصیل یا مصنف کی زندگی کا اور کوئی واقعہ ہمیں معلوم نہیں۔

ماہوا گیت کسی زمانے میں مشرقی مائی منسنگ میں بہت مقبول تھا لیکن محبت کی آزادی اور معاشقہ جو اس میلوڈراما کی خصوصیت ہے ان تقلید پسندوں کو اپنی طرف متوجہ نہ رکھ سکی جو برہمنوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے روز بروز زیادہ قریب ہوتے گئے۔ اس لئے فطرتاً ہندوؤں میں اس کی مقبولیت گھٹتی گئی اور رفتہ رفتہ یہ پسندیدہ گیت بالکل فراموش کر دیا گیا۔

دیہاتی اور دوسرے کم درجہ کے لوگ اور بالخصوص مسلمان بعض اوقات اس گیت کے کچھ نغمے اب بھی گاتے ہیں۔

اس گیت کا موضوع تاریخی ہے۔ وہ مقامات جن کا ذکر اس میں کیا گیا ہے کنچن پور، بامن کاندی، دہاتو ندی ——— وغیرہ سب کے سب "نترو کونا" کے تقسیم در تقسیم حلقۂ انتظام میں داخل ہیں اور کھالیہ جوری پولیس اسٹیشن کے تحت ہیں۔ رزمت پور سے پندرہ میل شمال میں تالار ہوڑ کا وسیع دلدل، بامن کاندی، بیدرڈگی، ٹھاکر باریبھٹیا، علوا کاندی او... ... سے مقامات کھنڈر کی صورت میں موجود ہیں جو ایک زمانے میں خانہ بدوش چھیپوں کے آماجگاہ تھے۔ اور اسی سرزمین سے ہمارے گیت کا نامراد ہیرو نادرچند تعلق رکھتا ہے۔ ان مقامات پر اب کوئی انسانی آبادی نہیں ہے۔ ہاں ان سے متصل شیبی علاقوں میں بزمانۂ موسم شالی چاول کے گھنے کھیت اور اُن کی خمیدہ سنہری بالیاں اب بھی نگاہوں کو آسودگی بخشتی نظر آتی ہیں۔

نادرچند کی مقامی زندگی کے متعلق لوگ بہت سے واقعات بیان کرتے ہیں۔ بیدار ڈگی کا تالاب جو اب علوا کاندی کہلاتا ہے جیسی سردار ہومرا نے بنوایا تھا اور ٹھاکر باریبھٹیا اس مقام کی یادگار ہے جہاں برہمن راجاؤں کا عظیم الشان محل واقع تھا۔

سارے کا سارا گیت دیہاتیوں کی بھونڈی بنگالی زبان میں لکھا گیا ہے لیکن بلحاظ دلکشی پیچیدہ پلاٹ اور ہیرو اور ہیروئن کی سادہ پرکاری کے یہ گیت بنگالی ادب میں ایک مخصوص انفرادی حیثیت رکھتا ہے۔

بدیہی طور پر یہ ڈراما رومانی دبستان سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس رومان کے بیشتر واقعات مطابق حقیقت اور سچے ہیں۔ وہ حالات جو اکثر موقعوں پر پیدا کئے گئے ہیں، وہ معیار کی سطح تک پہنچتے تو ہیں مگر ڈرامائی تیزی کے ساتھ پلٹا کھا جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ڈرامائی گیت کے جواب میں بنگالی ادب کا کوئی دوسرا شہ پارہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو پلاٹ کی جامعیت رومانی حالات، دیہاتی عناصر کی زرخیزی، اختصار زور اور ادبی حسن کے لحاظ سے ماہوا کا مقابل ہو۔

ماہوا ——— جیسی لڑکی

۱۔ ہومرا ——— جیسی سردار

اگر خشکی سے سفر کیا جائے تو گارو پہاڑیوں تک پہنچنے کے لئے ۶ ماہ درکار ہوتے ہیں۔ ان پہاڑیوں کے اس پار ہمالیہ کے برفانی سلسلے ہیں اور ان سلسلوں کے پرے سات سمندر ہیں۔ سورج اور چاند اس خطہ پر نہیں چمکتے۔ کوئی انسانی سایہ یہاں حرکت نہیں کرتا۔ گھنے جنگل شیروں اور ریچھوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

ان جنگلوں کے قریب کسی زمانے میں ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ ہومرا جپسی اُن کا سردار تھا۔ اے میرے مسلمان اور ہندو دوستو! اس جپسی سردار کی داستان سنو۔ وہ ایک ڈاکو تھا۔ جماعت کا سرگروہ۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی مانیکا تھا۔ یہ مختلف مقامات پر آوارہ گشتی کرتے۔ اب میں کچھ تفصیل کے ساتھ جپسیوں کے اس گروہ کی حیرت انگیز داستان بیان کروں گا۔

ایک دفعہ انہوں نے بہت دور کا سفر کیا اور دملو ندی کے کنارے تک پہنچ گئے۔ جہاں ایک گاؤں کنجن پور آباد تھا۔ اس بستی میں ایک بوڑھا برہمن رہتا تھا اور اُس کی ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی تھی۔ یہ بچی چھ ماہ کی تھی۔ اور ایک شب جب رات آخر ہو رہی تھی جپسیوں کا سردار ہومرا اُسے چرا کر فرار ہو گیا۔

یہ چھ ماہ کی بچی ایک پنچھی کی طرح گھر کی چار دیواری میں محصور رکھی گئی اور بڑی چاہ سے پالی گئی ——— یہاں تک کہ یہ لڑکی جپسیوں کی گود میں بڑھ کر ۱۶ سال کی ہو گئی۔ اس نے دیگر ہنر کے علاوہ رسی پر چلنے میں کمال حاصل کیا۔ اس کا حسن اتنا پیارا اور چمکیلا تھا جیسے ناگ کے پھن کا ہیرا ——— جس کسی نے اُسے دیکھا مسحور ہو گیا۔ جب وہ چلتی تو اُس کے لانبے لہراتے ہوئے بال اس کے شفاف ٹخنوں سے ٹکراتے۔ گال جیسے چمپا کے کھلتے ہوئے پھول۔ بڑی اور چمکتی ہوئی آنکھیں رات کے تاروں کی طرح دلکش ——— غرض ایک لمحہ کے لئے اُسے دیکھنا عمر بھر کے لئے فراموش نہ کرنا تھا۔ تارک الدنیا رشی اپنی مقدس قسموں کو توڑ کر اُسے اپنانے کے لئے سوچنے لگتے۔ اس لڑکی کے ساتھ ہومرا گاؤں گاؤں گھوما کرتا۔ ہومرا کی بیوی نے اس کے حسن کی مناسبت سے اس کا نام ماہوا رکھا (ماہوا ——— ایک جنگلی پھول ہے جو پہاڑی علاقوں میں پیدا ہوتا ہے)

۲۔ گارو کی پہاڑیاں

ہومرا نے ایک دن اپنے بھائی مانکا سے کہا "اب ہم کو اپنا تماشا دکھانے کے لئے کسی دور دراز مقام پر جانا چاہئے۔"

مانکا بولا "بہت اچھا ہم آئندہ جمعہ کو چل کھڑے ہوں گے۔"

جمعہ کی صبح کو جپسیوں نے اپنا سامان باندھا اور سفر کے لئے تیار ہو گئے۔ جپسیوں کا سردار ہومرا اپنے بھائی مانکا کے ساتھ سب کے آگے چلا اور اُن کے پیچھے بے شمار تماشہ کرنے والے جپسی ——— ان کے ساتھ سکھائے ہوئے طوطے، چھوٹے کوے، سنہری چونچ والے "دیال" اور دیگر پرندوں کے علاوہ خیمے، رسیاں اور بانس بھی متعدد گھوڑے اور گدھے گاڑیوں میں لدے ہوئے تھے کامیابی کا طلسم یعنی جادو کی پڑیا "چندل" بھی ہمراہ تھی۔ بہت سے سدھائے ہوئے شکاری کتے بھی ساتھ تھے۔ اس تمام سامان کے ساتھ ساتھ وہ آہستہ آہستہ بڑھتے گئے۔ ان میں خوبصورت ماہوا بھی تھی۔ وہ اپنی سہیلی پلنکا کے ساتھ ہنستی کھیلتی اور بات کرتی جاتی تھی ——— کئی دن گزر گئے اور مہینے کے خاتمے پر وہ ایک گاؤں بامن کانڈی پہنچے۔

۳۔ نادر چند کا دربار

گاؤں کا حاکم نادر چند تھا ——— ایک برہمن نوجوان ——— وہ دربار میں اپنے درباریوں اور دوستوں کے درمیان ایسا بیٹھا تھا جیسے تاروں کے وسط میں چاند۔

دربان لانگرائے آکر اطلاع دی "اے معزز راجہ! آج ہمارے گاؤں میں خانہ بدوشوں کی ایک جماعت وارد ہوئی ہے۔ یہ لوگ اپنے کرتب دکھانا چاہتے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی ہے۔ اتنی خوبصورت عورت آج تک ہماری آنکھوں نے نہیں دیکھی۔"

نادر چند یہ سن کر زنانے میں گیا اور آداب کر کے اپنی ماں سے کہا "جپسیوں کی ایک نئی جماعت ہمارے گاؤں میں آئی ہے۔ یہ لوگ اپنے کرتب دکھانا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اُن کو بلانا چاہتا ہوں۔"

ماں:۔ ان کو کتنی رقم دینی ہوگی۔

نادر چند:۔ ایک سو روپے۔

ماں:۔ ہاں! تم انہیں تماشہ دکھانے کی اجازت دے سکتے ہو۔ ہمارے محل کے بیرونی وسیع احاطے میں یہ کھیل ہوگا۔

۴۔ جپسی تماشے

ہومرا نے اپنے بھائی کو بلایا اور کہا "کمان اٹھا اور ترکش کو تیروں سے بھر لے۔ ہم کو آج اپنے کرتب دکھانے کے لئے

نوجوان حاکم کے محل پر جانا ہے۔"

ہومرا نے ڈھول بجانے کا حکم دیا اور اس کو سن کر گاؤں کے چاروں طرف سے لوگ دوڑ دوڑ کر آنے اور جمع ہونے لگے۔

ایک آدمی نے دوسرے سے کہا "آج ہمارے مالک کے حکم سے جپسیوں کا کھیل ہونے والا ہے۔ ہم کو جلدی کرنا چاہئے۔"

لوگ چاروں طرف بیٹھ گئے۔ نوجوان حاکم نے ان کے درمیان اپنی جگہ پسند کی اور کھیل شروع ہونے کا انتظار ہونے لگا۔

جونہی وہ جپسی لڑکی نمودار ہوئی اور لانبے بانسوں کو ایک دلکش انداز سے حرکت دینے لگی نادر چند جو اب تک بیٹھا ہوا تھا، کھڑا ہو گیا اور جبر سے اُسے گھورنے لگا لیکن جب وہ دوشیزہ لانبے بانس کی چوٹی تک پہنچ گئی اور وہاں اپنے کرتب دکھانا شروع کئے تو نادر چند بے اختیار ہو کر چلاّ اٹھا "دیکھو! دیکھو وہ کہیں اوپر سے گر کر مر جائے۔"

وہ بانس کی چوٹی پر سرو قد کھڑی ہو گئی اور ہاتھوں (میں) طنبورہ بجا بجا کر گانے لگی اور ایسا کرتے وقت اس کی چوڑیوں کی جھنکار ایک مست ترنم پیدا کر رہی تھی۔ اور تب وہیں سے وہ ہنستی ہوئی بولی۔

"میں نے اپنا کرتب دکھایا۔ مجھے نوجوان حاکم کی طرف سے ضرور کوئی انعام ملنا چاہئے۔" لیکن وہ اپنے دل میں سوچ رہی تھی "کیا میں اس نوجوان کا دل جیت سکتی ہوں۔ میرے لئے یہ انعام سب سے بہتر ہوگا۔"

نادر چند نے فوراً اپنی شال جسے وہ اوڑھے ہوئے تھا اور جس کی قیمت سو روپے تھی اس کو بطور انعام دے دی۔ اس کے علاوہ اور بہت سی رقم دی۔

ہومرا نے رہنے کے لئے ایک مکان کی درخواست کی۔

نوجوان نے فوراً زمین کا ایک اچھا پلاٹ اس کو مفت عطا کیا۔ یہ انعام ایک باقاعدہ تحریر کے ساتھ دیا گیا۔ علاوہ اس کے چاول اور دیگر اناج اتنی مقدار میں دیا گیا جو ان کے لئے کئی ماہ تک کفالت کر سکتا تھا۔

تب نادر چند نے کہا "تمہارے قبضے میں اب کافی زمین ہے اور اس کی دستاویز بھی میں نے تمہارے ہاتھ میں دے دی ہے۔ میرے گاؤں کے اس حصے میں جاؤ جو علوا کا ندی کہلاتا ہے اور جہاں تمہاری زمین واقع ہے۔ وہاں ایک عمدہ مکان بنواؤ۔"

اس خطہ زمین پر ایک خوبصورت مکان بنایا گیا لیکن ماہوا جب اس میں داخل ہوئی تو رونے لگی۔ اس کے منہ بولے باپ نے "برنجل" پودے لگائے اور کہا "رو نہیں پیاری ماہوا! میں برنجل بیچوں گا اور ان روپوں سے تیرے لئے ایک موتیوں کا ہار خرید دوں گا۔"

اس نے نئے باغ میں مختلف قسم کی سیم اُگائی اور نہایت نرم لہجہ میں ماہوا سے کہا "یہ سب کس کام کی ہیں ماہوا! اگر تو یہاں میرے ساتھ نہ رہی۔ مجھ سے وعدہ کر کہ تو یہیں رہے گی ورنہ میں اپنا گلا کاٹ کے مر جاؤں گا۔"

خوردنی اشیاء باغ کی اس سرزمین میں فراواں طور پر پیدا ہوئیں اور بوڑھے جپسی نے ماہوا سے وعدہ کیا کہ وہ اسے بیچ کر کنگنوں کا ایک جوڑا اس کے لئے خریدے گا۔ پھر جب کیلے پکے تو اس نے کہا کہ وہ ان کے فروخت کی قیمت سے اس کے لئے ایک خوبصورت لچھہ لائے گا۔

خانہ باغ کے چھت کی دیواریں دروازے کے شیشوں سے سجائی گئیں اور انہیں چاروں طرف سے پودوں اور بیلوں کی لانبی لانبی شاخوں سے گھیر دیا گیا۔ ایک روز اس نے چند کبوتر، ہنس اور طوطوں کا شکار کیا اور لڑکی سے فرمائش کی کہ وہ ان کا عمدہ سالن پکائے اور پھر کہا۔ "دیکھو اس میں گرم مسالہ ڈالنا نہ بھولنا بالخصوص خالی زیرہ۔"

اس طرح ہومرا نے جپسی لڑکی کو خوش کرنے اور اس کا دل بہلائے رکھنے کی کوشش کی۔

۵۔ نادر چند، ماہوا ـــــ ندی گھاٹ

ایک دن نادر چند اس راہ سے گزر رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ سرِ راہ گھروں میں چراغ ابھی ابھی روشن ہوئے تھے۔ ماہوا گاؤں میں اپنا ناچ دکھا کر اکیلی واپس ہو رہی تھی وہ اس سے تنہا ملا اور چپکے سے کہا "اے دوشیزہ! کیا تو میری ایک بات سننے کے لئے کچھ دیر ٹھہرے گی۔ جب چاند کی کرنیں چپکے چپکے افقِ مشرق پر پھیلنے لگیں اور سورج مغرب کے کناروں میں چھپ جائے ـــ کیا کل ایسے

وقت میں ندی گھاٹ پر تنہا تجھ سے ملنے کی توقع رکھوں — اگر تیری گاگر پانی بھرنے کے بعد تیرے نازک ہاتھوں سے نہ اٹھ سکی تو میں تیری پیاری سکھی بن جاؤں گا۔ اور اس کو اٹھا کر سر پر رکھنے میں تیری مدد کروں گا"

دوسرے دن جب شام کا دھندلکا رات کی تاریکی میں تبدیل ہونے لگا۔ ماہوا پانی کا گھڑا لے کر ندی کی طرف چلی۔ نادر چند گھاٹ پر بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

نادر چند۔ تو اپنے گھڑے میں پانی بھرنے کے لئے اس قدر مصروف کیوں نظر آتی ہے۔ اے حسین لڑکی میں نے کل تجھ سے کیا کہا تھا تجھے کچھ یاد بھی ہے

ماہوا۔ لیکن اے اجنبی راجکمار! آپ نے کل کیا کہا تھا اس کا ایک حرف بھی مجھے یاد نہیں۔

نادر چند۔ اتنی کمسن، اتنی جوان — اور اتنی بھولکڑ۔ کل میں نے تجھ سے کہا تھا —

ماہوا۔ لیکن آپ ایک اجنبی راجکمار ہیں۔ میں آپ سے بات کرتے ہوئے ڈرتی ہوں۔

نادر چند:۔ بھولی لڑکی! تو نے اپنی گاگر ندی میں ڈبو دی ہے اور ہلکی ہلکی لہریں پانی کی سطح پر پیدا ہو رہی ہیں — تو اس سمے کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہے۔ اے دوشیزہ! ہنس اور مجھ سے بات کر۔ یہاں ہمیں دیکھنے والا کوئی نہیں تیرا باپ کون ہے؟ تیری ماں کہاں ہے؟ ہمارے گاؤں آنے سے پہلے تو کہاں رہتی تھی۔

ماہوا۔ میرے ماں باپ کوئی نہیں راج کمار! نہ ہی میرا کوئی بھائی ہے۔ جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ میں اُس گھاس کی طرح ہوں۔ جسے تالاب سے باہر نکال کر پھینک دیا گیا ہو۔ میں بہت بدنصیب ہوں راجکمار! میں ان جیپسیوں میں رہتی رہتی جیپسی بن گئی ہوں۔ میرے دل میں ایک آگ ہے۔ جو مجھے اندر ہی اندر جلاتی ہے۔ ان میں کوئی ایسا نہیں جو مجھے سمجھ سکے۔ جس کے آگے میں بے تکلف اپنا درد کہہ سکوں۔ آپ تو ایک خوبصورت بیوی رکھتے ہیں راج کمار اور اُس کے ساتھ گھر میں ہنسی خوشی بسر کرتے ہیں۔

نادر چند:۔ تیرا دل پتھر کے مانند سخت ہے خوبصورت لڑکی! تیرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سچ نہیں۔ میری کوئی بیوی نہیں میں ابھی کنوارا ہوں۔ تیرا دل کتنا سخت ہے اور سخت ہے تیرے ماں باپ کا دل۔ انہوں نے اب تک تجھے جیون ساتھی نہیں دیا تو اپنی جوانی یوں ہی ضائع کئے دے رہی ہے۔

ماہوا۔ آپ کا دل کتنا سخت ہے اور سخت ہے آپ کے ماں باپ کا دل اب تک انہوں نے آپ کے لئے کوئی دلہن تلاش نہیں کی۔ آپ کی جوانی کتنی بے کار گزر رہی ہے، اے اجنبی!

نادر چند:۔ یہ سچ ہے لڑکی! میرا دل سخت ہے اور سخت ہے میرے ماں باپ کا دل لیکن میں تجھے یقین دلاتا ہوں۔ اگر کسی تجھ جیسی نادان لڑکی کو اپنا بنا سکا تو اتنا سخت دل نہ رہوں گا بلکہ ایک رحم دل پتی بن جاؤں گا۔

ماہوا: (غصہ کا اظہار کرتے ہوئے) آپ کو ایسی گفتگو کرتے ہوئے لاج نہیں آتی۔ آپ کے الفاظ توہین آمیز ہیں۔ جائیے ایک گھڑا لائیے اور اس کو اپنی گردن میں باندھ کر خود کو ندی میں ڈبو لیجئے۔

نادر چند:۔ تیری تجویز مجھے منظور ہے۔ خوبصورت عورت! تو ندی بن جا اور میں اس میں خود کو ڈبو لوں گا۔

۶۔ پلنکا اور ماہوا

پلنکا۔ بہن ماہوا خدا کے لئے میری سن۔ کیا تو مجھ سے اپنے دل کا راز نہ کہے گی۔ تو ندی گھاٹ پر روز شام کو اکیلی کیوں جاتی ہے۔ تو ساری ساری رات رو کر گزارتی ہے۔ میں تیرے گالوں پر آنسوؤں کی دھار کے نشان پاتی ہوں۔ مجھ سے راز داری میں ان باتوں کا سبب کہہ ڈال تو کیوں اکثر آہیں بھر کر میں راج کمار کے محل کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی ہے۔ یہاں ایسی افواہ ہے کہ نادر چند تجھے چاہتا ہے۔ تیرے گالوں نے اس پر جادو کر دیا ہے۔

ماہوا نے رکتے رکتے اپنی داستان بیان کی "پیاری

پلنکا: میں اپنے دل کا بوجھ کیسے ہلکا کر دوں۔ ہم کو اب یہ جگہ چھوڑ دینی چاہئے ہیں نے بہت کوشش کی لیکن اپنے دماغ کے بہاؤ کا رُخ نہ بدل سکی ہیں اس کی وجہ بھی نہیں بتا سکتی ہیں نیک مشورے بھی نہیں سن سکتی۔

پلنکا۔ پیاری بہن! تو میری رائے پر عمل کر سات دن تک ندی گھاٹ پر جانا چھوڑ دے۔ اگر وہ یہاں دریافت کرنے آئے گا تو میں کہہ دوں گی کہ خوبصورت ماہوا گزشتہ شب مر گئی۔

ماہوا۔ اگر میں اُسے ایک دن کے لئے نہ دیکھوں تو یہی میری موت کے لئے کافی ہے۔ سورج، چاند اور تو میری پیاری سکھی گواہ رہنا۔ یہ نوجوان برہمن میرے من کا شوہر ہی ہو سکتا ہے کہیں جپسیوں کے ساتھ چلی جاؤں۔ وہ جہاں بھی جائیں گے مجھے لے جائیں گے۔ مگر بعض مالو تم میں سے کسی میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ مجھے اس جماعت کا ساتھ دینے کے لئے مجبور کر سکے میں اسی راجکمار کے ساتھ جاؤں گی۔ پروا نہیں وہ جہاں چاہے مجھے لے جائے۔ اگر میں ایسا نہ کر سکی تو زہر کھا لوں گی یا گلے میں پھندا ڈال کر جان دے دوں گی۔

۷۔ ہومرا اور مائنکا

ہومرا:۔ میں کہتا ہوں مائنکا! اب یہ جگہ چھوڑ کر ہمیں کہیں اور چلا جانا چاہئے۔ میں یہ خوش منظر مکان اور باغ لے کر کیا کروں گا۔ در در بھیک مانگ کر جینا بہتر ہے۔ کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ میری لڑکی ماہوا برہمن راجکمار کو چاہنے لگی ہے۔

مائنکا۔ آپ یہ کیسی فضول بات کہتے ہیں بھائی۔ ہم یہ عمدہ مقام کیسے چھوڑ سکتے ہیں۔ ہمارے تالاب کی اترتی سیڑھیاں پتھر کی ہیں۔ ہمارا یہ خوشنما تالاب کیسے چمکیلے پانی سے لبالب ہے۔ دیکھئے۔ خانہ باغ کے قریب ہمارے کھیت کیسا ہنس رہے ہیں۔ "شالی" کی فصل پک چکی ہے۔ اس کی بالیاں کتنی سنہری ہیں۔ جب ہم اسے پیس لیں گے تو ہماری مرغن غذا شیوا تیار ہو جائے گی۔ خدا کے لئے اس

مقام کو چھوڑنے کا قصد نہ کیجئے۔

۸۔ رات کا سنسان وقت۔ ماہوا۔ نادرچند

مارچ کا مہینہ قریب الختم ہے۔ فطرت کے لبوں پر اپریل کا تبسم آ چکا ہے۔ درختوں کی شاخوں سے کوئل کی مسرت انگیز "کو کو" سنائی دے رہی ہے۔ "شالی" چاول کی فصل اپنی کھلی ہوئی اور پکی ہوئی بالیوں کے ساتھ کھیتوں میں لہلہا کر عجیب منظر پیدا کر رہی ہے۔ آدھی رات کو نادرچند خواب سے جاگا۔ اُس نے اپنی بانسری لی اور اس کی آواز ماہوا کے کانوں تک پہنچائی۔ آسمان پر کہیں "لوا" گا رہا تھا۔

بانسری کی آواز سن کر خوبصورت ماہوا جاگ پڑی۔ نئے نئے بنے ہوئے گھروں میں جپسی گہری نیند میں غافل تھے۔ بانسری کے نغمے نے اُسے مسحور کر لیا اور وہ فوراً اپنے کمرے سے باہر آئی تب وہ آہستہ آہستہ اور چھوٹے چھوٹے قدموں کے ساتھ ندی گھاٹ پر گئی جہاں نادرچند بیٹھا اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ جپسی لڑکی نے اس کی باہوں میں خود کو سپرد کرتے ہوئے کہا "میں اپنے ماں باپ، اپنا مکان اور اپنی دولت سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ میں تمہارے ساتھ دور بہت دور کسی مقام پر جاؤں گی۔"

وہ بہت روئی اور اُس کی گردن میں بیل کی طرح لپٹی ہوئی بولی "میں ایک محبوس طائر کی طرح مجبور رہوں۔ کاش تم ایک پھول ہوتے جسے میں اپنے بالوں میں لگا لیتی میں قسم کھاتی ہوں کہ میں اپنی زندگی ختم کر لوں گی ہم کو جدا ہو جانا چاہئے آپ اپنے محل واپس جائیں اور مجھ کو یہاں اکیلا چھوڑ دیں میں التجا کرتی ہوں۔ میری قسم میرے واسطے کوئی غم نہ کرنا۔"

وہ ہچکیاں لے لے کر رونے لگی — دونوں اس طرح ادھر مصروف راز و نیاز تھے اور اُدھر اندھیرے میں چمکتی ہوئی دو آنکھیں اُن کا تعاقب کر رہی تھیں۔ ہومرا اُن کے قریب ہی پیچھے ایک پگڈنڈی پر تھا۔

اور جب صبح کے آثار مشرق سے عیاں ہونے لگے۔ نادرچند اپنے محل کو واپس ہوا اور ماہوا اپنی باہوں میں گاگر تھام

کر گھاٹ کی سیڑھیوں پر آئی۔

۹۔ آخری ملاقات رہتی ہیں،

ماہوا۔ میرے مالک! آج رات ہم آپ کا گاؤں چھوڑ دیں گے مجھے اپنے رضاعی ماں باپ کے ساتھ جانا ہوگا۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب ہم کبھی نہ ملیں گے۔ نہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے۔ آپ کتنے بے رحم ہیں میں بغیر آپ کے کیسے جی سکوں گی میں ایک مجبور عورت ہوں اپنی ذات اور برادری کو نہیں ٹھکرا سکتی۔ میں اپنے بڑوں کی مرضی کے خلاف کیونکر کر سکتی ہوں میں اپنا باغ اپنا گھر سب کچھ چھوڑے جا رہی ہوں اور آپ کو بھی — آہ میں اپنے دیوانے دل کو کیونکر قابو میں رکھوں گی۔ افسوس اب میں کبھی اپنے مالک کی میٹھی بنسری اپنے بلانے کے لئے نہ سن سکوں گی۔ اب میں کس کے واسطے بیدار رہا کروں گی۔ اور کس کی محبت میں اپنی راتوں کو خوشگوار بناؤں گی اب میں آپ کا ہنستا ہوا چہرہ دوبارہ دیکھنے کے لئے خواب سے کبھی نہ جاگوں گی۔ اب کہاں آپ، کہاں ندی گھاٹ اور کہاں میں — خاموش ہو جانے سے پہلے میں ایک بات اور کہوں گی۔ اگر اس کے بعد آپ کبھی مجھ سے ملنا چاہیں تو کچھ دنوں بعد گارو پہاڑیوں کے شمال میں آیئے۔ وہاں سرکنڈوں کی لانبی لانبی گھاس سے گھرا ہوا آپ ایک مکان پائیں گے۔ اس کے دروازے جنوب کی جانب کھلے ہوں گے۔ اگر آپ ہمارے اس مکان میں آئیں تو اس کے مہماں نواز دروازے کھلے پائیں گے — اوہ میں آپ کی تواضع کر کے کتنا خوش ہوں گی۔ میں آپ کے کھانے کے لئے شالی چاول کی "چیرا" اچھے کیلے اور بھینس کے دودھ سے تیار کیا ہوا دہی فراہم کروں گی۔ لیکن شاید یہ آخری ملاقات ہے۔ اور ہم دوبارہ کبھی ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے۔

۱۰۔ حبشی اپنا نیا مکان چھوڑ دیتے ہیں

ہومرا۔ ماں کا میرا گمان سچا نکلا۔ اب میں یہاں ایک لمحہ زیادہ نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ باغ اور یہ گھر جہنم میں جائے۔ مجھے نئی پکی ہوئی "شالی" کی فصل کی اب پروا نہیں۔ میری زندگی کی قسم اب ہم یہاں ایک دن زیادہ نہ ٹھہریں گے۔ انہوں نے اپنے بانس رسیاں اور دیگر تمام چیزوں کو باندھ لیا — اور رات کی تاریکی میں یہ حبشی برہمن راج کمار نادر چند کے گاؤں سے نکل گئے۔

انہوں نے اپنے بنے ہوئے خوبصورت مکانات، باغ، کھیت اور میووں کو درخت غرضکہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ لوگ اُن کے اچانک غائب ہو جانے سے بہت حیرت زدہ ہوئے۔

لیکن جب نوجوان راج کمار نے سنا تو کھانے کے لئے اُس نے جو لقمہ اٹھایا تھا۔ وہ ہاتھ سے نیچے گر گیا۔ اس کے ماں باپ نے اُس سے بہت سوالات کئے لیکن اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عام طور پر لوگ کہتے تھے کہ راج کمار کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔

۱۱۔ نادر چند اپنا گاؤں چھوڑ دینے کا قصد کرتا ہے

نادر چند۔ (خود سے) گھر گر گیا ہے۔ چھت بیٹھ گئی ہے۔ پرندہ اڑ گیا پنجرہ باقی ہے۔ یہاں وہ اس باغیچہ میں اکیلی بیٹھتی اور پہروں پھولوں کے ہار گوندھتی رہتی — دن اور مہینے گزر گئے اور ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ میں ایک برہمن تھا۔ لیکن میری قسمت کچھ اور ہی تھی۔

نادر چند (اپنی ماں سے) میرے کھانے کے لئے چاول تیار کر دیجئے۔ میرے راستے میں حائل نہ ہو جیئے۔ میں دور دراز مقامات کے مندروں کی پوجا کے لئے جانا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دیجئے۔

ماں:۔ تم میری آنکھوں کے تارے ہو میرے بچے۔ تم ایک لمحہ کے لئے مجھ سے جدا ہوتے ہو تو مجھ پر ایک برس کی جدائی کے صدمے گزر جاتے ہیں۔ تم میرے اکلوتے لڑکے ہو۔ اس ہمارے محل میں اور کون ہے جس کے لئے رات کا چراغ روشن کیا جائے۔ تمہارے ساتھ میں ایک بھکارن بن کر بھی رہ سکتی ہوں۔ لیکن بغیر تمہارے رانی بن کر محل میں نہیں رہ سکتی۔ پیارے بچے! موسم سرما کی کتنی راتیں میں نے تمہارے لئے جاگ کر آنکھوں میں کاٹی ہیں کیسی کیسی تکلیفیں اور کیسے کیسے مصائب میں نے برداشت کئے ہیں۔ تم کو میں اپنی ساری کے آنچل میں ڈھانپ لیتی اور خود اپنی ننگی پیٹھ کو سردی میں اکڑ جانے کے لئے چھوڑ دیتی۔ ماں کے دل

کا درد تجھے کیونکر سمجھایا جائے۔ جب لڑکا ـــ دور کہیں کسی نامعلوم پردیس میں مر جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کو ماں کا دل ایک عجیب بیکلی محسوس کرتا ہے۔ نہیں میں تجھ کو جانے کی اجازت نہیں دیتی۔ اگر تم محل چھوڑتے ہو تو یہ یاد رکھو کہ میرا دل ٹوٹ جائے گا ـــ میں مر جاؤں گی۔

۱۲۔ نادر چند اپنا گھر چھوڑ دیتا ہے

رات گہری نیند میں تھی۔ نادر چند نے کیا کیا؟ وہ چپکے سے اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوا۔ سوتے میں اس کو آداب بجا لایا۔ اُس نے سورج چاند کو اپنا گواہ بناکر کہا "آج میں اپنا محل چھوڑ رہا ہوں اور وہ تمام چیزیں جن کو میں اب تک اپنی کہتا تھا۔ میں اپنے ماں باپ اور دوسرے عزیزوں کو چھوڑتا ہوں۔ میں اپنی تمام دولت اپنے عزیزوں کی اپنی خوشی سے دیتا ہوں" تب اُس نے سورج سے روشنی لینے والے آسمان چاند اور تاروں کو سلام کیا۔ پھر اپنے ماں باپ کو۔

اور تب رات کی تاریک اور خاموش گھڑیوں میں نادر چند نے ایک خانہ بدوش لڑکی کی خاطر اپنے گھر کو خیرباد کہا۔

۱۳۔ نادر چند ماہیا کو ڈھونڈتا ہے

وہ بنارس گیا، اور بند۔ اِن کے منادر کو نہیں گیا۔ اس کو ان سے کیا کام؟ اس کو جس چیز کی تلاش ہے وہ جپسی لڑکی ہے۔ ایک ماہ، دو ماہ، تین ماہ گزر گئے اور اس کو معلوم نہ ہو سکا کہ ماہیا کہاں چلی گئی تھی۔ وہ پہاڑیاں کہاں گئیں جن کے متعلق وہ کہا کرتی تھی۔ نادر چند رات اور دن پاگلوں کی طرح گھوما کرتا۔ اُس نے مسافروں کو راہ سے گزرتا دیکھا اور اُن سے اُس نے دریافت کیا ـــ کیا تم نے جپسیوں کی کسی جماعت کو گزرتے دیکھا ہے۔ چرواہوں کے لڑکے کھیت میں دوڑتے اور کھیلتے تھے اور ہمارے نوجوان راج کمار نے ان سے پوچھا "کیا تم نے ماہیا نام کی کوئی جپسی لڑکی دیکھی ہے؟ اس کی آنکھیں تاروں کی طرح نشیلی ہیں۔ اس کے بال بادلوں کے مانند ہیں۔ کیا میری وحشیوں آواز طوطی ان آسمانوں سے ہو کر گزری ہے۔ وہ خوبصورت اونچے اونچے بانسوں پر چڑھتی ہے اور رسی پر ناچتی ہے۔ اس کے گھنگھریالے بال اس کے چہرے پر لوٹتے ہیں۔ جب وہ تاریک کمرے میں بیٹھتی ہے تو اس کے سنہرے بدن کی چمک سونے کی طرح جھلکتی ہے۔ ایسی حسینہ کے ساتھ ایک جپسی سردار جگہ جگہ گھومتا ہے۔ باغ میں پھول کھلتے ہیں اور پہاڑوں پر چمکدار پتھر جگمگاتے ہیں۔ لیکن کوئی شے اتنی حسین نہیں ہے جتنی کہ وہ ـــ میں اس کے لئے دیوانہ ہوں۔

یہاں اس ندی میں اترنے کی سیڑھ جہاں کتنی خوبصورت ہیں یقیناً وہ انہیں زینوں پر سے اپنی گاگر میں پانی بھرتی تھی ـــ یہی وہ راستہ ہے جس پر وہ چلتی تھی۔ اگر میں اس وقت یہاں ہوتا تو اس کو دور سے پانی بھرتا اور لے جاتا دیکھ کر کتنا خوش ہوتا۔

افسوس ماہیا میں تجھ سے کیونکر ملوں۔ کیا ہم نے ایک دوسرے کے سامنے قسمیں نہیں کھائی تھیں کہ ایک دن کی جدائی بھی ہم کو زندہ نہ رکھے گی۔

. . . .

وہ اُس مقام کی علامات کو دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ یہاں کھانا پکاتی تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور رو دیا۔ اُس نے گھوڑوں کے سُم کے نشانات دیکھے اور وہ نصف کٹی ہوئی گھاس ـــ جسے جپسیوں کی بکریوں نے کھایا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ وہ وہاں مارچ اور اپریل میں تھے۔ مئی اور جون کا مہینہ اسی طرح گزر گیا اور نوجوان مسافر اجڑے مقامات اور ناہموار راستے دور دور کے طے کرتا رہا۔ تب جولائی اور پھر اس کے بعد اگست۔ پھر بادل مشرقی افق سے اُٹھ کر مغرب کی طرف گرجنے لگے اور یوں ہی ستمبر اور اکتوبر ختم ہو گیا۔ اور ان مہینوں میں نادر چند رات اور دن اس جپسی لڑکی کو اطراف و اکناف میں ڈھونڈتا رہا۔

اکتوبر کے مہینے میں اُس کے گھر درگا دیوی کی پوجا بڑے اہتمام سے کی جاتی تھی۔ لیکن اس سال اس کے مندر میں مورت ہی نہ تھی۔ ماں باپ روئے۔ عزیزوں نے سوگ منایا۔ اور وہ اسی طرح سورج کی شعاعوں میں جلتا اور بارش میں بھیگتا تن تنہا اپنے مصیبت بھرے دن گزارتا رہا۔

ماہ نومبر میں بنگال کی مائیں کارتک کی پوجا کرتی ہیں اور اپنے بچوں کی سلامتی کی پرارتھنا کرتی ہیں لیکن آج اس کی ماں کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔

دسمبر میں جبکہ ابھی سردی "کالکتا" کے کنارے پر اپنی انتہا کو نہیں پہنچی تھی اچانک وہ ماہوا سے ملا ——— جیسے کسی پیاسے ہونٹ پر پانی کا کوئی قطرہ پڑ جائے یا جیسے کسی دیوانے بھونرے کو ایک پر بہار کنول کی خوشبو مل جائے۔

۱۴۔ مہمان

آج ایک اجنبی ہمارے گھر مہمان ہے۔

ماہوا اپنا گھڑا ہاتھ میں لئے ندی کے گھاٹ پر پانی کے لئے جا رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر لوگ کہہ رہے ہیں "اس کا پر بہار شباب مرجھا کر پیلا پڑ گیا ہے۔"

وہ نہ تو رات کو سوتی ہے اور نہ اپنے معمول کی غذا کھاتی ہے وہ کہتی ہے کہ اس کے سر میں ایک درد ہے جو اُسے پاگل بنا دیتا ہے۔ اور یہ کہ اُس کے جسم میں مستقل درد رہتا ہے۔ وہ زمین پر اپنی ساری کا پلو بچھا کر لیٹ جاتی ہے اور روتی رہتی ہے۔ وہ کبھی کبھار پکاتی ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھیل لیتی ہے۔ اس طرح ۶ ماہ گزر گئے۔ زندگی اس کے لئے بوجھ بن گئی ہے۔

لیکن آج کیا تبدیلی نظر آرہی ہے۔ ایک جسم جو ۶ ماہ سے نیم مردہ تھا۔ اس میں نئی زندگی آگئی ہے

وہ ندی گھاٹ پر جا کر اپنا کھانا پکاتی ہے۔ مہمان اپنے مذہب کو نبھاتا کہ اُس کا ہاتھ بٹاتا ہے۔

ہومرا۔ ماتنکا میں آج آزماؤں گا کہ یہ اجنبی کس قسم کا آدمی ہے (مہمان سے) اے نوجوان تم ہمارے پاس رہو۔ نٹوں کی طرح رسیوں اور بانسوں کے کرتب دکھانا ہمارا پیشہ ہے میں تم کو اس ہنر میں کامل بنا دوں گا۔ اس کو دلچسپی سے سیکھنا۔ سال بھر ہم گاؤں اور قصبوں میں اپنے کھیل دکھاتے ہوئے پھرتے ہیں۔

۱۵۔ ہومرا ماہوا کو ایک چاقو دیتا ہے

یہ ایک اندھیری رات تھی۔ تارے آسمان پر چمک رہے تھے۔ جیسی لیڈر دیر تک غور کرتا رہا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ "کانگسا" ندی کے کنارے "ہیجل" کا ایک درخت تھا۔ نادر چند پتوں کا بستر بنا کر اس کے نیچے سو رہا تھا۔

ماہوا اپنے بستر پر بے خبر سو رہی تھی۔ ہومرا اس کے پاس آیا اور چلا کر کہا "اے لڑکی اُٹھ! میں نے ۱۶ برس تک تیری پرورش کی۔ آج تجھے میرا کہا ماننا چاہیئے۔ میں تجھ سے اپنی ان تمام مہربانیوں کا صرف یہی ایک صلہ چاہتا ہوں۔"

ماہوا اپنے پریمی کا سپنا دیکھ رہی تھی کہ اُس کے باپ کی آواز بادلوں کی گرج کی طرح اس کے کان میں پہنچی۔ وہ چونک کر بستر پر اُٹھ بیٹھی جونہی اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اس نے دیکھا اس کا رضاعی باپ سامنے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

اُس نے کہا "یہ چاقو لے اور ندی کنارے جا۔ وہاں نادر چند سو رہا ہے تجھ کو اُسے فوراً قتل کرنا ہوگا۔ اور پھر اس خون آلود چاقو کو ندی میں پھینک دے۔ تیری پرورش میں میں نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائی ہیں یقین مانو یہ اجنبی سلانے والے جادو کا عامل ہے۔ یہ ہمارا دشمن ہے یہ چاقو سیدھا اس کے دل میں بھونک دینا ہوگا۔"

آسمان پر چاند نہ تھا اور جو تارے بھی چمک رہے تھے غائب ہو چکے تھے۔ خوبصورت آسمان کے ان سنہرے چراغوں کو بادل نے اپنے دامن میں چھپا لیا تھا اور سارا آکاش ایک بڑی بھربند کتاب معلوم ہو رہا تھا۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور پھر چاقو لے کر ندی کی طرف چلی جہاں نادر چند سو رہا تھا۔ اس کے لانبے کھلے ہوئے بال ہوا میں لہرا کر اُس کے ٹخنوں پر رقص کر رہے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ وہ پاگل سی ہوئی جا رہی تھی اُس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔

۱۶۔ ماہوا ندی گھاٹ پر جا کر روتی ہے

اُس نے چاہا کہ اپنے دل کو پتھر کا بنا لے اور وہ سوتے ہوئے نادر چند کے قریب بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت کتنا خوبصورت نظر آرہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چاند آسمان سے نیچے زمین پر ندی کے کنارے آگرا ہے ——— اور تب ماہوا بولی "اے نوجوان تم کب تک سو گے۔ اُٹھو دیکھو تمہاری بدنصیب ماہوا رو رہی ہے میرے باپ کا دل پتھر کا ہے۔ اُس کا حکم ہے کہ میں تمہیں قتل کر دوں۔ لیکن میں ایسا کیونکر کر سکتی ہوں میرے باپ کا دل پتھر کی طرح سخت ہے اور

سخت ہے پتھر کی طرح میری ماں کا دل۔ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ میرا دل بھی ان کی طرح پتھر کا ہو اور میں تمہیں قتل کر کے گھر واپس جاؤں۔ ہماری محبت کا چراغ گھی سے جلایا گیا ہے میں اسے اپنی ہی پھونک سے کیونکر بجھا دوں۔ میرے باپ کا حکم موت کی طرح اٹل ہے لیکن ٹھہرو میں اس کے حکم کی اس طرح تعمیل کروں گی۔ اس چاقو کو دیکھو۔ اس کے پھل میں زہر ملا ہوا ہے۔ میں اسے اپنے دل میں بھونک لیتی ہوں

وہ اپنے خواب میں اسی کو دیکھ رہا تھا اور اب جاگنے پر وہ اس کو خودکشی کرنے پر آمادہ پا رہا تھا۔

ماہوا۔ میرے ماں باپ بے رحم ہیں اور میرے دل کو بھی ویسا ہی سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور میں یہاں اسی لئے آئی ہوں۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میں خود کو مار ڈالتی ہوں تو تمہاری تمام تکلیفیں دور ہو جاتی ہیں۔ جاؤ اپنے گھر واپس چلے جاؤ۔ اس قدر جلد جتنا تیز تم جا سکتے ہو ——— اور اپنی ماں کی آغوش میں پہنچ جاؤ جس کے تم خزانے ہو۔ ایک اچھی دلہن تلاش کرو اور اس سے بیاہ کر کے خوش خوش رہو۔ تم ایک باعزت راج کمار ہو۔ میں تمہارے ہنستے بولتے گھر کے لئے موت ہوں۔ میں محبت میں دیوانی ہو کر بغیر سوچے سمجھے آپ کو پریشان کرتی رہی مجھے انجام سے بے خبر ہو کر ایسا نہ کرنا چاہئے تھا۔ (وہ اپنے دل میں چاقو بھونک لینے کا قصد کرتی ہے لیکن نادر چند اس کا ہاتھ تھام لیتا ہے اور خودکشی سے باز رکھتا ہے)

نادر چند۔ ماہوا میں نے اپنا باپ، اپنی ماں اور اپنی ذات سب کچھ تیری خاطر چھوڑ دیا۔ میں ایک بھونرے کی طرح ہوں جسے ماہوا کے دلکش پھول نے موہ لیا ہو۔ میں ایک پاگل کی طرح پہاڑوں اور ویرانوں میں گھومتا رہا۔ اگر تجھے چھوڑنا بھی پڑا تو بھی میں اپنے گھر نہ جاؤں گا۔ اور جا بھی کیسے سکتا ہوں؟ میرا دھرم جاتا رہا۔ میں خوش ہوں کہ میں نے تیری خاطر یہ قربانی کی۔ یہ میری بدبختی ہے کہ میں تجھے حاصل نہ کر سکا۔ میں التجا کرتا ہوں۔ اپنے نازک ہاتھوں سے چاقو اٹھا اور میرے سینے میں بھونک دے۔

ماہوا۔ نہیں میرے پریمی یہ نہیں ہو سکتا۔ آج میں اپنے ماں باپ اور اپنا گھر سب کچھ چھوڑ دوں گی۔ مجھے اب ان سے کوئی مطلب نہیں اگر تم مجھے چرنوں میں جگہ دینا قبول کرو گے تو میں تمہارے ساتھ کہیں بہت دور چلی جاؤں گی۔ تم پوچھو گے کہاں۔ جہاں ہماری آنکھیں رہبری کریں۔ ہم خود کو چھپانے کے لئے پہاڑوں سے گھرے ہوئے جنگلوں میں غائب ہو جائیں گے۔ میرے باپ کے پاس عمدہ گھوڑے ہیں۔ وہاں ندی کے اس کنارے پر اس کا اصطبل ہے۔ ہم کو ان میں سے دو پر سوار ہو کر ذرا رہو جانا چاہئے۔ نہ تو میرے باپ اور نہ ہی کسی کو اس کا علم ہو گا۔ ہم چاند اور سورج کو گواہ بنا کر یہ مقام ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے

مشرق کے پتلے باریک بادل ندی گھاٹ پر صبح کی آمد کی چمک دے رہے تھے۔ مرد اور عورت کا ایک جوڑا گھوڑوں پر سوار ندی کے کنارے خوش خوش فرار ہو رہا تھا۔ وہ سورج اور چاند کی طرح شاندار دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کوڑے استعمال کئے اور گھوڑے پرندوں کی سی تیزی سے ہوا میں اڑنے لگے۔

۷۔ نہر کا کنارہ

ماہوا۔ اے میرے باپ کے گھوڑو! جاؤ اب اس کے گھر چلے جاؤ جو اب یہاں سے بہت دور ہے۔ میرے والدین سے کہنا "آپ کی لڑکی ماہوا کو ایک شیر نے پھاڑ ڈالا" اس نے گھوڑوں کی پیٹھ تھپکی اور وہ جس راستے سے آئے تھے اسی سمت واپس ہو گئے۔

"لیکن راج کمار" ماہوا بولی "ہم اس غصیلی پہاڑی نہر کو کیونکر پار کر سکیں گے؟"

اس نے نہر سے مخاطب ہو کر کہا "کاش تو کچھ دیر کے لئے اتھلی ہو جاتی اور ہم تجھے عبور کر لیتے"

مگر نہر اسی تیزی سے بہتی رہی۔ تیز ہواؤں کے چلنے سے اس میں طوفان سا آ رہا تھا۔ عین اس وقت انہوں نے ایک کشتی کو اپنی طرف آتا ہوا دیکھا ——— یہ سفید پرندے نہیں بلکہ کشتی کے بادبان ہیں۔ اس کشتی میں ہم سوار ہوں گے خواہ ہم پر کچھ ہی گزرے ——— انہوں نے کہا اور اپنی خوش بختی پر مسکرائے۔

انہوں نے کشتی والوں سے چلّا کر کہا "آپ کی کشتی نزدیک اور دور ہر جگہ کا سفر کرتی ہے۔ یہاں ہم دو جنے ہیں جو ندی کو پار نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ہماری مدد فرمائیں تو ہم اس غیر آباد ساحل پر جانے سے بچ جائیں گے۔"

کشتی کے مالک سوداگر نے ماہوا پر ایک نظر ڈالی اور اس کے حسن نے اسے مخمور کر دیا۔ اس نے ملاح کو حکم دیا کہ کشتی کو کنارے سے لگایا جائے۔ ماہوا اور نادر چند اس میں بیٹھ گئے اور کشتی ہوا کی تیزی سے روانہ ہوئی۔

۱۸۔ سوداگر کی کشتی میں

سوداگر سوچنے لگا کہ وہ اپنے دل و دماغ پر چھائی ہوئی ماہوا کو کس طرح حاصل کرے۔ اس نے ملاح سے رازدارانہ گفتگو کر کے ایک پلاٹ بنایا اور کشتی طوفان کے مقابل چلنے لگی —— اور تب اچانک نادر چند پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا ڈوبتا نظر آیا۔ اس کے قریب ہی ایک تاریک بھنور ہر چیز کو جو اس کی زد میں آتی نگلتا جا رہا تھا۔ نادر چند بھی انہیں میں سے ایک تھا۔ "الوداع میرے والدین اب میں آپ لوگوں کے درشن کبھی نہ کر سکوں گا۔ پیاری ماہوا رخصت مجھے یاد رکھنا آج ہم ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہے ہیں!"

"جن لہروں نے میرے نادر چند کو ڈبو دیا ہے کاش مجھے بھی اپنے اندر سمو لیں" یہ کہہ کر ماہوا نے پانی میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن ملاح نے اسے پکڑ لیا —— اُف شریر سوداگر کتنا بے رحم تھا۔

سوداگر: "تیری آنکھیں بڑی اور سیاہ ہیں۔ تیرے بال لانبے اور گھنے ہیں۔ خوبصورت دوشیزہ! آج قسمت نے مجھے فطرت کے منتخب ترین پھول کو سونگھنے کا موقع بخشا ہے۔ بھولی لڑکی! اپنی جوانی کو یوں بے کار ضائع نہ کر۔ میری محبت کا جواب محبت سے دے۔ اور مجھ کو خوش کر۔ یہ تعجب خیز نہیں کہ اگرچہ کشتی سنہری ہے لیکن کوئی اس کا کھینے والا نہیں۔ جوانی ڈھل جانے کے بعد دنیا تیرا اس قدر خیال نہ کرے گی۔ کلی کی طرح اپنی مٹھاس کو چھپائے نہ رکھ بلکہ پورے کھلے ہوئے پھول کی طرح اس کو ہوا کے دامن میں بکھیر دے یقین مان میری زندگی تیرے ہاتھ ہے۔ تو چاہے تو اس میں مسرت کی لہر دوڑا سکتی ہے۔

میں تجھے سونے کے زیورات دوں گا۔ اور نفیس باریک ساڑیاں۔ تیرے کان اور ناک کے لئے طلائی پھول بنوا دوں گا۔ تیری یہ لانبی زلفیں مہکتے خوشبودار تیلوں میں بسائی جائیں گی۔ میرے گھر میں بہت سے خدام اور لونڈیاں ہیں۔ وہ سب تیری خدمت کریں گی۔ تیرا ہر حکم اشاروں پر بجا لائیں گی۔ وہ تیرا پاؤں دھوئیں گی۔ پیاری دوشیزہ! اور تیرے لئے نرم بستر آراستہ کریں گی۔ میں موسم سرما میں تیرے لئے پشمینے کی چادریں اور اونی لباس منگوا دوں گا اور لونڈیاں ہر وقت تیرے حکم کی منتظر رہیں گی۔

میرے پاس ہاتھی ہیں اور گھوڑے بھی۔ اور میرے ہزار دل خدمت گار ہیں۔ تم ان سب کی مالکہ ہو گی۔ میرے خانہ باغ میں نہایت عمدہ حوض ہیں اور ان میں اترنے کی سیڑھیاں پتھر کی ہیں۔ ان میں ہم تیریں گے، نہائیں گے اور دو آبی پرندوں کی طرح آپس میں کھیلیں گے۔ میرے محل کے اندر ایک پھولوں کا کنج ہے۔ ہم وہاں صبح شام پھول توڑتے ہوئے چہل قدمی کریں گے۔

ہم باہم اپنی راتیں کس مسرت سے گزاریں گے اور موسم سرما میں اے حسینہ میرے سینے کی گرمی تجھے سردی کا احساس نہ ہونے دے گی۔ اگر تیرا نازک جسم بستر کی بے چینی برداشت نہ کر سکے تو میری نرم چھاتی پر سر رکھ کر سو جایا کرنا۔ میں تیرے لئے اپنے ہاتھ سے پان بناؤں گا اور تیرے منہ میں رکھوں گا۔ ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے ساتھ کھائیں گے اور ساتھ سوئیں گے۔ اور جب میں تجارت کرتا ہوا دور دراز کا سفر کروں گا تو تو میرا دل بہلانے کے لئے میرے ساتھ رہے گی۔ میں تجارت کی آمدنی سے جواہرات اور قیمتی پتھر جمع کروں گا۔ اور یہ سارا خزانہ تیرا ہو گا۔ میں تیرے لئے ایک ہار بنواؤں گا جس کی قیمت ایک لاکھ روپیہ ہو گی۔ ان کے علاوہ میں اور بہت سے تحفے تیری نذر کروں گا اور تو دیکھے گی کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس کا ایک ایک حرف کس حد تک سچا ہے۔ تیرے مونگے کے کنگنوں پر سونے کے پتر چڑھوا دوں گا اور ایک قیمتی ساڑی جس پر زری کا کام کیا ہوا ہو گا دو سو لاکھ میں تجھے خرید دوں گا۔ میں تجھے ایک کمربند بھی دوں گا جس میں ہیرے جڑے

پہنے ہوں گے اور تیری پازیب میں سونے کی گھنگھروں ہوں گی جن سے رُنم رُنم چھم چھم کی جھنکاریں نکلیں گی ۔

ان لالچ سے بھری ہوئی باتوں کو سن کر ماہوا نے کیا کہا؟ اُس نے محبت جتانے والے سوداگر کے لئے چند پان کے بیڑے بنائے اور چونے اور کتھے کے ساتھ اُس نے اُن میں سانپ کا وہ زہر بھی ملا دیا جو اُس نے پہاڑوں سے فراہم کیا تھا اور اپنے سر میں چھپا رکھا تھا اور پھر اُس نے ہنستے ہوئے ایک ادا کے ساتھ ان میں سے ایک اٹھا کر سوداگر کے منہ میں رکھ دیا وہ اس کی میٹھی ہنسی سے مسحور ہو کر اُسے اپنی آغوش میں آنے کے لئے کہنے لگا لیکن وہ اتنی دیر میں اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پان کے بیڑے کشتی کے تمام لوگوں میں تقسیم کر چکی تھی — اور جوں جوں زہر رگوں میں سرایت کرتا گیا، وہ انگڑائی لے لے کر گہری نیند میں غافل ہوتے گئے۔ وہ اب بھی ہنس رہی تھی لیکن اب اس کی ہنسی جادوگرنیوں کی سی تھی، زہریلا چاقو اُس کے ساتھ تھا، اُس نے لنگر کی رسیوں کو کاٹ دیا — سوداگر کشتی کے تختے پر مردہ پڑا تھا پھر اُس نے طلائی زیور اتار لئے اور کیل اور نچلی پٹڑیوں کو اکھیڑ دیا اور قبل اس کے کہ کشتی ڈوب جائے خود پانی میں کود گئی اور جبکہ وہ لہروں پر تیر رہی تھی، اُس نے کشتی کو مع تمام مسافروں کے پانی کی تہہ میں جاتے دیکھا ۔

۱۹۔ ندی کے اس پار کا جنگل

ماہوا ساحل پر خود کو اکیلی پاتی ہے ۔

اُس پھول کو کون پوچھتا ہے جو جنگل کے کسی گوشے میں خود ہی کھلتا اور مرجھا جاتا ہے اور اس ہیرے کی قیمت ہی کیا جو معدن کے اندر ہی چمکتا ہے، وہ دوشیزہ دنیا کی نظروں سے دور تن تنہا اپنی قسمت کے مصائب برداشت کرتی رہی "پانی کی موجیں میرے نادر چند کو کدھر بہالے گئیں؟" وہ ہواؤں میں اڑنے والی چڑیوں سے دریافت کرتی اور جنگلی درندوں سے کہتی "اے جنگل کے ریچھ اور شیرو! مجھے کھا کر اپنی بھوک دور کر و لیکن پہلے مجھے اس کی کوئی خبر دو۔ میں جیسی سردار کی لڑکی تھی لیکن ایک اجنبی سے محبت کر کے میں نے اپنا گھر چھوڑ دیا۔

وہ ایک دیوانی کی طرح درختوں پر بیٹھے ہوئے ساتھ ہنسوں کی اپنے پریمی کا حال پوچھتی "افسوس! میں کس ریت کا تنکا ہوں، لمبی پانی میں کھو گیا۔ میں کتنی ابھاگن ہوں، خدا کے پاس میرے لئے کوئی رحم نہیں۔ میں کس سے اپنا دکھڑا کہوں!"

۲۰۔ ایک عجیب سنیاسی

بن کے درخت بغیر میوں کے تھے اور ندی بہت فاصلے پر تھی۔ وہ رفتہ رفتہ بہت کمزور ہو گئی۔ اس میں اتنی سکت بھی باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے قدموں سے چل کر اپنی بھوک پیاس دور کر سکے جنگل کے خوفناک ریچھ اس کے قریب سے گزر جاتے لیکن بدنصیب ماہوا کو اپنی غذا نہ بناتے، اگرچہ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ بڑے بڑے صحرائی بھیڑیے جو ہرنوں اور بکریوں کو نگل جاتے وہ بھی اس کو نظر انداز کر کے دوسرا راستہ اختیار کرتے ۔

"میں اُسے کیونکر بھول سکتی ہوں جس نے میرے لئے اتنی مصیبتیں برداشت کیں۔ اپنی ساری دولت اور اپنے گھر کے آرام کو چھوڑ دیا، دنیا بھر کے عیش اُسے حاصل تھے لیکن اُس نے انہیں خیرباد کہہ دیا، میری تلاش میں اُس نے پہاڑ جنگل، ندی اور ویرانوں میں آوارگی اختیار کی، بوالہوس سوداگر نے اُسے پانی کی لہروں کے حوالے کر دیا اب یا تو مجھ کو پانی میں خود کو ڈبو لینا چاہئے یا رسی سے کر پھانسی لگا لینی چاہئے، زندگی کا بوجھ اب ناقابلِ برداشت ہے، نہیں" وہ پھر سوچنے لگتی "ابھی میری تلاش پوری نہیں ہوئی میں اُس کے مرنے کا یقین نہیں کر سکتی۔ تاوقتیکہ میں ہر طرح سے اس کا کھوج نہ لگا لوں — لیکن یہ درد جنگل سو ایک نحیف کراہ کی آوازیں کیسی آ رہی ہیں"

شام کا وقت تھا اور راس دھندلکے میں اُسے ایک ویران مندر نظر پڑا جو سانپوں کا مسکن معلوم ہوتا تھا لیکن وہ بے خوف بمشکل چلتی ہوئی اُس میں گھس گئی نیم تاریکی میں وہاں اُس نے ایک لاغر جسم دیکھا جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچا رہ گیا تھا۔ گوشت نام کو نہ تھا، ہڈیاں صرف کھال سے ڈھکی ہوئی تھیں گویا ایک مردہ جسم رکھا تھا۔ وہ اس کے چہرے کو پہچان نہ سکی جو کسی وقت بہت خوبصورت تھا لیکن گھورتے گھورتے اُس کا شعبہ رفتہ رفتہ

دور ہٹتا گیا اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ نادر چند ہی ہے۔

عین اس وقت ایک سنیاسی وہاں آیا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور لمبی داڑھی کی وجہ سے اس کا چہرہ نہایت ڈراؤنا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ سنیاسی ماہوا کا حسن دیکھ کر حیرت زدہ ہوا اور بولا "اے خوبصورت عورت! تو ملک کے کس علاقے سے آرہی ہے۔ تو کس راجہ کے تاج کا ہیرا تھی اور تو نے ایسا کون سا گناہ کیا کہ اُس نے شباب کے اس نازک دور میں تجھے دیس نکالا دے کر اس ویران جنگل میں بھیج دیا۔ تیرے ماں باپ بہت سنگدل ہیں۔ وہ تجھ سے جدا ہو کر کیونکر جئیں گے۔"

ایسے ہمدردانہ الفاظ سن کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ سنیاسی کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگی۔ اس کے سر پر بندھے ہوئے بالوں کا گچھا زردی مائل بنا ہوا تھا۔ داڑھی اور مونچھ کا رنگ خاکستری تھا۔ عورت نے اپنی ساری داستان رو رو کر بیان کی۔

اور تب سنیاسی بولا۔ "پانی کی گہرائیوں میں ایک جڑی بوٹی ہوتا ہے۔ اس کے استعمال سے تمہارا شوہر صحیح ہو جائے گا۔ اس نوجوان کی ہڈیوں میں ایک خوفناک بخار جذب ہے لیکن وہ زندہ ہے ابھی مرا نہیں ہے۔ میں تجھے یقین دلاتا ہوں۔ جا اس ندی میں وہ پودا ہے اے خوبصورت لڑکی اُسے جس طرح بھی ممکن ہو حاصل کر۔ تھوڑا پانی بھی لیتی آ ــــ تو مجھ پر بھروسہ رکھ میں اس کو جلا دوں گا۔

وہ جڑی اس کے بدن پر لگائی گئی۔ ایک دو تین دن گزر گئے اور چوتھے دن نادر چند نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

سنیاسی نے ماہوا سے کہا "میرے لئے پھول توڑ کر لا۔ تجھ کو روز جنگل کے اندر تنہا پھول جمع کر کے لانا ہوگا۔ میں انہیں دیوتاؤں پر چڑھاؤں گا۔"

ماہوا نے ایسا ہی کیا۔ وہ ہر روز گھنے جنگلوں کے اندر چلی جاتی اور بید کی ایک ٹوکری میں سنیاسی کے لئے پھول توڑ کر لاتی اس مدت میں نادر چند اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھنے کے قابل ہو گیا۔ اُس نے چاول کھانے کو کہا۔ ماہوا بہت روئی۔ وہ اس جنگل میں چاول کہاں سے لائے؟

آج وہ پھول توڑنے کو نہیں گئی بلکہ نادر چند کے لئے چاول فراہم نہ کر سکنے کے غم میں دن بھر بیٹھی روتی رہی۔

لیکن سنیاسی ــــ اگرچہ وہ بہت بڑا رشی تھا، ماہوا کے حسن پر فریفتہ ہو گیا۔ ماہوا کے جمع کئے ہوئے پھول بید کی ٹوکری میں اب تک تازہ تھے مگر وہ بہت رات گئے مندر میں آیا اور اُسے پکارا "خوبصورت لڑکی اُٹھ! اگر تو اپنے پتی کی زندگی چاہتی ہے تو میرے ساتھ چل میں تجھے کچھ جڑی بوٹیاں حاصل کرنے میں مدد دوں گا۔ وہ فوراً تیار ہو گئی اور سنیاسی کے ساتھ ندی کے کنارے گئی۔ چاروں طرف خاموشی پھیلی ہوئی تھی اور سنیاسی نے اُس سے کہا "اے حسین عورت! میں تجھ سے التجا کرتا ہوں۔ اپنی جوانی میرے حوالے کر دے تو اتنی حسین ہے کہ باوجود بہت کوشش کے میں تیرے خیال کو اپنے دل سے نہ نکال سکا۔ تو ایک پھول ہے جس سے زندگی کی سانسوں کو بسانا اور لطف اٹھانا چاہئے۔ مجھے اپنے جذبات کی تسکین کے لئے ہر قیمت پر تجھے حاصل کرنا ہوگا۔ میں اپنے دماغ کا توازن کھو بیٹھا ہوں اور اس میں بجز تیری شبیہ اور کچھ نہیں۔

اس نے سنیاسی کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی تلوار اس کے سر پر آ گری ہو۔

کچھ دیر تک وہ سوچتی رہی پھر بولی "پہلے میرے شوہر کو پوری طرح صحت مند کر دے اور اس کو موت کے خطرے سے دور نکال دے تب تو جو حکم دے گا میں وہی کروں گی۔

سنیاسی یہ جواب سُن کر ذرا ڈر گیا اور گرج کر بولا "میں دو روز کی مہلت دیتا ہوں۔ اس کے اندر تمہیں اپنے شوہر کو زہر دے دینا ہوگا۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے۔"

وہ ایک بھوت کے پنجے میں تھی۔ وہ فرار ہو جانے کی کوئی تدبیر سوچنے لگی۔ اُس نے سارا واقعہ نادر چند سے بیان کیا اور مشورہ چاہا! وہ کس طرح فرار ہوں؟ یہ ایک سوال ان کے پیش نظر تھا وہ اب بھی بہت نحیف و لاغر تھا اور لڑکھڑا نہ ہو سکتا تھا۔ اس کے لئے بھاگ جانا ناممکن تھا۔

بہت سوچنے کے بعد اُس نے اپنی جگہ ایک بات طے کر لی۔ اُس نے نادر چند کو آہستہ آہستہ اٹھایا اور اپنے کاندھوں پر

بٹھا لیا۔ آدھی رات کا وقت تھا سدھ چلتی گئی۔ لیکن مڑ مڑ کے دیکھتی گئی کہ کہیں سنیاسی یا اس کا کوئی چیلا ان کا پیچھا تو نہیں کر رہا ۔

۲۱۔ کامیاب فرار

زمانہ گردش کرتا رہا اور چھ مہینے گزر گئے۔ نادر چند کی صحت ترقی کرتی گئی ۔ ماہوا نہر سے میٹھا پانی لاتی ۔ جنگل کے درخت انہیں میوے دیتے ۔ نادر چند کی صحت واپس آگئی۔

ایک دن وہ بازار جانے لگا تو جپسی لڑکی نے فرمائش کی کہ وہ اس کے لئے ناک کی ایک کیل لیتا آئے۔

دوسرے دن نادر چند جب کھانا کھا رہا تھا مچھلی کی ایک ہڈی اس کے گلے میں پھنس گئی۔ جپسی لڑکی نے فوراً منت مانی کہ اگر اس کا پتی دیوا اچھا ہو جائے گا تو وہ ایک سفید اور ایک کالے رنگ کی بکری دیوتاؤں کے بھینٹ چڑھائے گی۔

اور ایک بار جب نادر چند کو خفیف بخار آ گیا اور سر میں درد ہوا تو وہ جپسی لڑکی سرھانے بیٹھی اس کا سر دباتی رہی۔

. . . .

"ہم نے رہنے کے لئے اب تک کوئی مکان نہیں بنایا" پتنی نے اپنے پتی سے کہا "بلکہ آشیان بدوش چڑیوں کی طرح ہم روز ایک نئے مقام پر بسیرا کرتے ہیں۔"

تب انہوں نے مل کر پہاڑی ندی کو عبور کیا اور پھر آہستہ آہستہ بہت دور نکل گئے ۔ انہیں راستے میں ایک بڑی ندی ملی۔ ان دونوں نے پیر کر اُسے بھی عبور کیا اور دوسرے کنارے پہنچ گئے ۔ وہاں انہیں ایک خوش منظر مقام ملا جہاں جنگلی کوئل اپنے مسرت بھرے نغمے الاپتی ڈالی ڈالی پھرتی تھی اُسے وہ جگہ پسند آئی اور اُس نے اپنے حسین ساتھی سے کہا "یہاں ہم اپنا مکان بنائیں گے"۔ اس خطہ زمین کو سیراب کرتا ہوا ایک پہاڑی نالہ اپنی ناچتی ہوئی موجوں کے ساتھ پیچ و خم کھاتا ہوا گزر رہا تھا۔

"یہاں" نادر چند نے کہا "ہم قیام کریں گے اور اپنے دن گزاریں گے"۔ اُس نے سامنے ایک سرسبز خطہ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ادھر دیکھو ماہوا! پھول ارغوانی لباس میں کیسا ہنس رہے ہیں اور لذیذ میوے درختوں کی شاخوں سے لٹک رہے ہیں۔

نہر کا لہریں مارتا ہوا پانی آنکھوں کو کیسی ٹھنڈک بخشتا ہے"۔

وہ دونوں میووں سے لدے ہوئے درختوں پر اپنا گزر اوقات کرنے لگے ۔ ایک سایہ دار ہموار چٹان پر وہ سوتے۔ ان کی مسرت بخش راتیں ایک دوسرے کے آغوش میں کٹتیں۔ دن کے وقت وہ باہوں میں باہیں ڈالے تنہا جنگل میں گھومتے اور درختوں سے میوے توڑ کر کھاتے۔ وہ اپنے ماں باپ، دوست اعزا اور گھر سب کچھ بھول گئے۔ وہ دنیا سے دور ایک نیم پڑ شانہ فردوسی زندگی گزار رہے تھے۔

لیکن اچانک قسمت ایک ناگہانی مصیبت بن کر ان کے سر پر گرجی ۔

۲۲۔ خطرے کا اشارہ

ایک شام جب نادر چند ماہوا کے ساتھ بن کی ایک پگڈنڈی پر چہل قدمی کر رہا تھا ۔۔۔ وہ ایک گھنے جنگل میں داخل ہوئے اس طرح کہ ماہوا اپنی بیل جیسی باہوں کے ساتھ اس سے لپٹی ہوئی تھی۔ ایک مقام پر وہ ایک ہموار بڑے پتھر پہ ہنستے اور باتیں کرتے بیٹھ گئے۔ اس جگہ سے کچھ ہی دور ایک نالہ لہریں مارتا ہوا چمک رہا تھا لیکن دفعتہً ایک بانسری کی آواز سنائی دی اور ماہوا خوف سے لرزنے لگی ۔

نادر چند نے چمکارتے ہوئے پوچھا "کیا ہے پیاری ماہوا! کس چیز نے تمہیں پریشان کر دیا! تم زرد کیوں پڑ گئیں! آج تمہیں اپنی زندگی کے تمام واقعات بتانے ہوں گے۔ تمہارے ماں باپ کون ہیں! تم جپسیوں کے ساتھ کیوں رہتی تھیں! میں نے تم سے یہ سوالات کتنی دفعہ کئے لیکن آج تمہیں ساری داستان سنانی ہوگی۔ ضرور کوئی پراسرار بات اس سے وابستہ ہے کیونکہ جب کبھی میں نے تم سے پوچھا تم نے کچھ نہیں کہا اور رونے لگیں۔ تمہارے دل میں کوئی درد ہے جس کو تم اب تک مجھ سے چھپاتی رہیں۔ کل صبح صرف تم نے اس قدر بتایا تھا کہ جب تم چھوٹی تھیں ہومرا تم کو تمہارے باپ کے گھر سے چرا لایا تھا ۔۔۔"

"لیکن ٹھہرو ۔ وہ بانسری بج رہی ہے۔ ہم کو اب واپس چلنا چاہیئے۔ شام ختم ہو گئی۔ اگر میں کل تک زندہ رہی میرے مالک تو میں تمہیں سارا قصہ سناؤں گی۔"

تب جس طرح کوئی بھی تند ہوا کی تاب نہ لاکر ختم ہو جاتی ہے۔ ماہوا نادرچند کی آغوش میں گر پڑی۔

شاید تمہیں سانپ نے ڈس لیا ہے پیاری! تم اتنی زرد اور شکستہ دل کیوں ہو؟ تمہیں کیا تکلیف ہے؟" نادرچند نے پوچھا۔ اور جب وہ واپس ہو رہے تھے تو خشک پتے ان کے قدموں کے نیچے آ آ کر ساتھ ٹوٹ رہے تھے۔ پھر وہ اچانک ٹھٹک کر رک گئی جیسے اُسے کوئی خوفناک کانٹا چبھ گیا ہو۔ وہ چل نہ سکی اور کانپتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔ نادرچند نے گھبرا کر فوراً پتوں کا ایک بستر بنا کر اُسے وہیں لٹا دیا اور کہا۔ "ٹھہرو میں پانی لاتا ہوں۔ تمہارے ہونٹ خشک ہو رہے ہیں۔"

ماہوا نے رو کر کہا "آج اس زمین پر میرا آخری دن ہے۔ مجھے سانپ نے نہیں کاٹا بلکہ آج ہماری خوشی ہمیشہ کے لئے ختم ہو رہی ہے۔ تم نے دور جنگل سے بانسری کی آواز سُنی۔ ہمارا ضاعی باپ اور تمام مجھی آ پہنچے۔ میری سہیلی پلنکا نے بانسری بجا کر مجھے ان کے آنے کی خبر دے دی ہے۔ وہ کل صبح ہمیں مار ڈالے گا۔ صرف آج کی رات ہم ایک ساتھ بسر کر سکتے ہیں۔ کل یہ ساری مسرتیں ختم ہو جائیں گی۔ اب ہم ایک دوسرے کو کبھی نہ دیکھیں گے۔ جنگل کی میٹھی زندگی کو ختم کر کے اب ہمیں موت کی تلخ سرزمین میں جانے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

رات ختم ہو گئی۔ تارے آسمان سے غائب ہو گئے۔ وہ اپنی گھاس کی جھونپڑی کے دروازے سے باہر نکلے۔

۲۳۔ ہومرا کا حکم

انہوں نے اپنے چاروں طرف شکاری کتے پائے۔ ہومرا نے انہیں کی مدد سے انہیں ڈھونڈھ نکالا تھا۔ دوسرے لمحہ میں ظالم ہومرا موت کی طرح اُن کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں زہرآلود چاقو تھا جو سورج کی پہلی شعاعوں میں چمک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اور اس کی بھاری سانس بادل کی طرح پرشور تھی۔

ہومرا۔ ماہوا اگر تو زندہ رہنا چاہتی ہے تو سُن۔ ہمارے دشمن کو اس چاقو سے ہلاک کر دے۔ سوجن میرا دینی لڑکا ہے۔ اس سے شادی کر لے اور ہمارے ساتھ چل۔

ماہوا۔ لیکن میں اپنے شوہر کو کس طرح قتل کر سکتی ہوں! آپ جہاں ہیں وہیں کھڑے رہیں اور دیکھیں میں کیسے مرتی ہوں۔ اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

ہومرا۔ لیکن سوجن جوان ہے۔ تنومند اور خوبصورت ہے۔ وہ تیرا شوہر ہو گا۔ اُس سے شادی کر لے اور گھر واپس چل۔ میں نے تجھے جنگل جنگل نہ جانے کہاں کہاں تلاش کرتا رہا۔ خود رائے نہ بن۔

ماہوا۔ اے باپ! میں اپنے شوہر کو قتل کر کے اپنے گھر کس طرح جا سکتی ہوں۔ میں سوجن سے بیاہ نہ کروں گی۔ میرے پتی دیو کا چہرہ پگھلے ہوئے سونے کی طرح چمکتا ہے جیسے چاند اور سورج اور سوجن اس کے سامنے ایک حقیر جگنو کے مانند ہے۔ میرا پتی سونے سے بنے ہوئے درخت کی طرح خوبصورت اور جوان ہے۔ اس کی طرف ایک نظر دیکھ ـــــ اور میری آنکھوں سے دیکھ۔ تیری آنکھوں میں وہ بس جائے گا۔

کالا بادل غصہ میں زور سے گرجا اور چاقو ماہوا کے ہاتھ میں دے دیا۔

ماہوا نے صرف ایک نظر اپنی پیاری سہیلی پلنکا کو دیکھا اور بس ایک ہی نظر اپنے شوہر نادرچند پر ڈالی اور رو کر کہا۔

"اے میری جان سے زیادہ عزیز شوہر! مجھے الوداع کہئے آپ کی ماہوا اب آپ کے پاس کبھی نہ آئے گی۔ اور اے میری پیاری سہیلی پلنکا ایک تم ہی ہو جو میرے دل کے درد کو سمجھتی ہو اور مجھ سے ہمدردی رکھتی ہو اور اے باپ میں نہیں جانتی کہ کس کا چھوٹا خزانہ تو نے چرایا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ میرے ماں باپ کون ہیں۔ لُٹے ہوئے نصیب۔ اب میں رخصت ہوتی ہوں۔"

(ماہوا اپنے سینے میں چاقو بھونک کر مر جاتی ہے۔ جبھی ہومرا کے حکم سے نادرچند کو مار ڈالتے ہیں)

۲۴۔ ہومرا کا ماتم اور پلنکا کی جاں نثاری

میں اُسے اس وقت اپنے گھر لایا جب وہ چھ ماہ کی بچی تھی۔ اور یہ تمام مدت میں اس کی پرورش کرتا رہا۔ افسوس اب کون میرے

گھر کو سجائے گا" وہ چلی گئی۔ ماہوا، آنکھیں کھول اور صرف ایک نظر مجھے دیکھ۔ اپنے ہونٹ ہلا، اور ایک بار مجھ سے بول۔ میں اب گھر کس طرح واپس جاؤں؟ اپنے ساتھیوں سے: بہتر ہے اب تم لوگ اپنے گھر واپس جاؤ۔ میں کسی جنگل میں جا کر اپنے باقی دن گزار دوں گا۔"

تب وہ مانکا سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"میرے دوبارہ گھر واپس جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اس لڑکی کے لئے ایک قبر بناؤ۔ اس برہمن راج کمار نے ماہوا کے لئے اپنا گھر اور اپنی ساری دولت چھوڑ دی۔ دونوں ایک دوسرے سے سچی محبت کرتے تھے۔ ان دونوں کو ایک ہی قبر میں دفناؤ۔"

انہوں نے اپنے سردار کے حکم کی تعمیل کی اور تب وہ اس مقام، اس قبر کو چھوڑ کر چلے گئے

. . . .

پنکلان کے ساتھ نہیں گئی۔ وہ وہیں رہ گئی۔ وہ ماہوا کے بچپن کی سہیلی تھی۔ اس کے دکھ درد کی ساتھی۔ وہاں وہ اپنے دن رات رو رو کر گزارتی۔ وہ جنگل سے پھول توڑ کر لاتی اور انہیں قبر پر بچھا کر اس کی مٹی کو اپنے آنسوؤں سے تر کرتی۔ بعض اوقات وہ ایسے درد بھرے گیت گاتی کہ ساری فضا غم سے بوجھل ہو جاتی۔ کبھی وہ پاگلوں کی طرح قبر سے کہتی:۔

"پیاری سہیلی اٹھ۔ تو یہاں کب تک سوتی رہے گی۔ میں تیری سکھی ہوں مجھ سے بول۔ حبشی گھر واپس گئے۔ اب وہ تجھے ستانے نہ آئیں گے۔ اٹھ اور پھر ایک بار اس ویرانے کو آباد کر۔ اب کوئی تیرے راستے میں حائل نہ ہوگا۔ ظالم حبشیوں نے تیرا تعاقب چھوڑ دیا ہے۔ ہم نے اپنا لڑکپن ایک دوسرے کی گود میں گزارا ہے اور اب ہم دونوں مل کر تیرے پتی کے لئے پھولوں کے ہار گوندھیں گی۔"

ماہوا کی سچی سہیلی پنکا کے آنسو ہر روز اسی طرح قبر پر برسا کرتے۔

علی احمد بی اے

(افسانہ ترجمہ)

ہرجائی

ایک ہی تان پہ موقوف ہے سارا نغمہ
ایک ہی تان پسند آئے کہاں تک مجھ کو
ایک ہی پھول پہ بھنورے کی بسر ہو کیسے
کیا کوئی پھول نہیں اور کوئی پھول نہیں
پھول کھلتے ہیں ہزاروں تو چمن کھلتا ہے
سینکڑوں رنگوں کے ملنے سے شفق کھلتی ہے
آسماں پر ہیں ستارے بھی ہزاروں لاکھوں
کندنی جسم کی لہریں نہ مجھے مرغوب سہی
سرمگیں آنکھوں کا پھیلا یا ہوا جادو بھی
بن کے ساون کی گھٹائیں مجھے ڈستا ہے
الجھی زلفیں، یہ لچکتی ہوئی پتلی سی کمر
باعثِ عشرتِ امروز تو بن سکتی ہے
پر تنوع بھی تو اک لازمۂ ہستی ہے
ایک ہی تان پہ رک جائے تو نغمہ کیسا!
ایک ہی پھول گلستاں کبھی کہلاتا ہے!

طالب شیرازی

سازِ ہندی (غزل)

چھلکے آنسو چھلکی لاگ — کچا پانی کچی آگ
رکھ سنسار سے سچی لاگ — جھوٹا تیاگ اور بیراگ
روکھے سوکھے روپ کے بھاگ — ان پھولوں میں رس نہ پراگ[1]
آگ بھبھوکا گورا مکھڑا — زلفیں کاٹے کالے ناگ
حسن ہے دریا عشق ہے شعلہ — پانی میں لگ جائے نہ آگ
کھول اے دنیا آنکھیں کھول — جاگ او نیند کی ماتی جاگ
کومل مردل گات یوں جیسے — سہج سبھاؤ پریم بے لاگ[2]
روپ پہ یوں لہلوٹ ہے دنیا — جیسے گت پر ناچے ناگ
جادو جادو مد بھری آنکھیں — شعلہ شعلہ مد بھرے راگ
دریا دریا گریۂ عشق — صحرا صحرا عشق کی آگ
کر کے دکھا کچھ اے کے نہ بیٹھ — جیون کے دکھ کا جھگڑا اگ
عشق کا سہل نہیں ہے مٹانا — موت کے منہ پر آگیا جھاگ
بولتا ساز ہے جسم کسی کا — چھڑا ہوا ہے پریم بہاگ[3]
وہ آکاش کی دیوی اتری — چندر کرن پر گاتی راگ
کومل پاؤں پڑے ہیں لیکن — جیسے دھرتی جائے جاگ
"تان" "تان" پر کو کٹتی ہے — لو دیتا ہے پریم کا راگ
حسن نے جب جب ہنس کر چھیڑا — لایا عشق ہزاروں راگ
پھولیں پھلیں سنسار میں کیونکہ — بنا رہے دنیا کا سہاگ
اس کی نگاہوں کے پڑتے ہی — من کی جوت گئی ہے جاگ
کھیل رہے ہیں پریم اور روپ — کیسا لگاؤ کہاں کی لاگ
آج منا لے دنیا ہولی — اپنے لہو سے کھیل لے پھاگ
کالی رات میں پڑی دراڑ — کھلتے ہیں دنیا کے بھاگ
توسنِ وقت کے سواروں کے — ہاتھ سے چھوٹ گئی ہے باگ
آنکھ کے اندھے گانٹھ کے پورے — کیا کیا ایسوں کے بھاگ
سونے کو تو عمر پڑی ہے — اک دنیا میں آج ہے جاگ[4]
اور ہی دھن ہے اب جیون کو — کیسا رنگ کہاں کا راگ
دنیا کی منزل بدلے — پھر وہ راہ کی موڑ دے باگ
لیں گے قدم سورج اور چاند — جس نے سادھا ہے بیراگ
شام کے سائے ہیں دنیا کو — ساز جنوں دیتا ہے راگ[5]
انگڑائی لیتی ہے جوانی — یا ہے چھلکتی پگھلی آگ
کھلا نگاہ سے دل کا حال — تانت باجتے بوجھا راگ[6]
پوچھ نہ کیا ہے وہ رس کی پتلی — بھیتر ٹھنڈک باہر آگ
آتے ہی جل اٹھے چراغ — روپ ہے تیرا دیپک راگ
لہرائے آکاش میں تارے — جیسے رات پڑی ہو جاگ
یوں لہراتی ہیں وہ زلفیں — جیسے گت چلتا ہو ناگ[7]
جھلمل جھلمل روپ ہے تیرا — جگمگ جگمگ تیرا سہاگ
من کی سیتا عشق اکیلا — پھٹ نہ پڑے یہ شنکر بھاگ
حسن شبنمی پیراہن میں — جیسے دبی دبی سی آگ
پریم روپ والوں میں یوں ہے — جیسے کوئی پرانا کھاگ
چنچل چپل روپ یوں جیسے — ادھ کھلی کلیاں ادھ سنے راگ
ہاتھ نہ ڈال محبت میں — آگ ہے آگ ہے آگ ہے آگ

ڈس نہ لے تجھ کو کہیں یہ فراق
بھاگ بلا ئے عشق سے بھاگ

فراق گورکھپوری

---

۱ زردگل ۲ نرم اور نازک جسم ایسا ہے جیسے معصوم اور نرم دل محبت بے لاگ ہوتی ہے۔ مردل کا لفظ ہے MRIDUL ۳ ایک راگ کا نام ۴ رحنہ . . . . ۵ شب بیداری (انیس) یہاں جاگ بھی سوتا تھا۔ مدر شنکر ناری ۶ آسبی کو راگ دینے سے وہ ملتے جیسے لگتا ہے ۔ ۷ تانت باجی راگ بوجھا۔ تانت باجی راگ پایا کہاوت ہے۔ ۸ گت چلنا یعنی گت پر ناچنا۔ ۹ شوخ، بچلا نہ بیٹھنے والا۔ بجلی کا سبھاؤ بھی چنچل ہے۔

چاندی کے تار

اب جبکہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور تم ایک دوسرے شخص کی آغوش میں جا چکی ہو مجھے تمہیں خط لکھنے کا حق حاصل ہو گیا ہے گو یہ ایک عجیب سی بات ہے کہ جب تم خط لکھتی تھیں تو میں جواب دینے سے قاصر تھا اور اب میں تمہیں خط لکھ رہا ہوں لیکن تم اس خط کا جواب دینے سے معذور ہو گی میرے لئے یہ بوجھ بھی ناقابلِ برداشت ہو کہیں ایک شادی شدہ عورت کو خط لکھوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اس خط کا تمہارے خاوند پر کیا اثر ہو گا اگرچہ میں اس امر کی پوری کوشش کروں گا کہ یہ خط سیدھا تمہارے پاس پہنچے اور تمہارے خاوند کو اس خط کا علم ہی نہ ہو لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خط تمہارے شوہر کو مل جائے۔ یونہی ڈاکیہ غلطی کر سکتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ ہو گا میں اس کا بھی تصور کر سکتا ہوں کیونکہ ایک ہندوستانی شوہر یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی دوسرا مرد اس کی بیوی کو خط لکھے اور پھر یہ حقیقت اس پر آشکار ہو کہ اس کی بیوی کسی اور سے محبت کرتی رہی ہے اور اب تک یہ راہ و رسم جاری ہے۔ اس بھید کا کسی ہندوستانی خاوند پر کھلنا کوئٹہ کے بھونچال کے مترادف ہو گا۔ وہ اپنے شباب کی غلطیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔ آخر ہر شخص شادی سے پہلے محبت کرنا چاہتا ہے اور کرتا ہے اگر اسے موقعہ مل جائے لیکن یہ حق شاید عورت کو حاصل نہیں، وہ تو محض ایک جانور تصوّر کی جاتی ہے جو ماں باپ کی کڑی نگاہوں میں مقید رہتی ہے۔ ایسے شوہروں کے لئے عورت ایک مقدس چیز ہے۔ اجنٹا کی تصویر کی طرح محض ایک دیوی جس پر جذبات کا اثر نہیں ہو سکتا جس پر ماحول کبھی حاوی نہیں ہوتا جس پر زمانے کے نشیب و فراز کا کوئی اثر نہیں۔ آج کل کی لڑکیاں اس امر کی گواہ ہیں کہ زمانے کی بدلتی ہوئی رُتوں نے، حالات اور ماحول نے ان پر کیا اثر کیا ہے اور اگر ان باتوں کو لوگ سمجھ جائیں تو شاید دنیا میں خودکشی کرنے والوں کی تعداد آدھی رہ جائے [illegible] عورتوں کو [illegible] جھگڑے کے بعد طلاق کی نوبت نہ آئے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ دراصل بات یہ ہے کہ اگر یہ خط تمہارے خاوند کو مل جائے اور تمہیں وہ لعنت ملامت کرے یا پیٹے تو ان باتوں کو نظر انداز کر دینا اور ان تکلیفوں کو ماضی کے خوشگوار لمحوں کی خاطر سہہ لینا۔ گو میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی توقع کرنا محض بے وقوفی ہے کیونکہ تم مجھے گالیاں دو گی، لعنت بھیجو گی اور کہو گی کہ یوں بیٹھے بٹھائے ایک نیا فتنہ اٹھا دیا لیکن میں اس فتنے کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا چاہتا ہوں، گو تمہارے لئے یہ فتنہ اسی دن ختم ہو گیا جس دن تمہاری شادی ہوئی لیکن میں ابھی تک کنوارا ہوں، اور یہ فتنہ سو سو کر جاگ اٹھتا ہے۔ اور مجھے بار بار پریشان کرتا ہے، یہ پریشانیاں میری دماغی نشوونما کے لئے اچھی نہیں، یہ کسک، جو دل میں بار بار اٹھتی ہے اسے ایک بار کیوں نہ نیست و نابود کر دوں۔ تمہاری محبت کا قصہ میرے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے، جتنا کہ ایک سائنسدان کے لئے جراثیم کی ایک نئی سلائیڈ۔ جو اس نے ابھی ابھی تیار کی اور خوردبین کے نیچے رکھ کر اسے نہایت انہماک سے دیکھ رہا ہو۔ گو تمہاری محبت کا قصہ پرانا ہو گیا۔ اور اس پر شادی کا رنگ چڑھ چکا لیکن میرے پاس چند ایسی چیزیں ہیں جو مجھے بار بار تمہاری یاد دلاتی ہیں۔ تمہاری چند مسکراہٹیں۔ تمہارے خط، تمہارا ریشمی رومال۔ جو تم نے دیوالی کے روز اپنی ننھی بتو کے ہاتھ بطور تحفہ بھیجا تھا۔ گو تمہاری مسکراہٹوں کی جگہ اب نئی مسکراہٹیں آ چکی ہیں۔ ان کی جگہ اور دلفریب لبوں نے لے لی ہے اور ان کا اثر میرے کمزور اعصاب پر زیادہ پڑتا ہے لیکن ان مسکراہٹوں میں بناوٹ ہے۔ اور ان میں وہ شے لطیف نہیں جو تمہارے تبسم میں تھی۔ تمہارا تبسم بالکل البیلا۔ انوکھا نرالا تھا۔ شاید تم نے پہلی بار مسکرانا سیکھا تھا۔ اس مسکراہٹ میں ایک نیا پن تھا جس میں آنے والے شباب کی صبح تھی، ایک انجان معصوم مسکراہٹ۔ بناوٹ سے کوسوں دور

ایک بھیگی ہوئی صبح کی طرح شگفتہ، تر و تازہ، شبنم کی طرح ٹھنڈی اور چمکدار، شعلہ کی طرح سرخ اور آگ لگانے والی۔ ا ـــــ و ـــ ر ـــــ لیکن میں اب ان مسکراہٹوں کو بھول چکا ہوں۔ اب صرف اُن کا تجزیہ کر سکتا ہوں بالکل ایک ڈاکٹر کی طرح جو ایک مرض کو دوسرے مرض سے تشخیص کر لیتا ہے۔ اب بھی کوئی نہ کوئی میری طرف دیکھ کر مسکرا لیتا ہے، اور یہ مسکراہٹ بجلی کے کوندے کی طرح مجھ پر حملہ کرتی ہے۔ حملہ نہایت شدید ہوتا ہے۔ سر نا پا ایک جھرجھری سی آجاتی ہے لیکن دوسرے لمحے میں میں سنبھل جاتا ہوں اور اس مسکراہٹ کا تجزیہ کرنے لگتا ہوں۔

ہم ایک مشینی دور میں سے گذر رہے ہیں۔ ہم اس زمانے میں پیدا ہوئے جب پانی، ہوا، پر انسان نے قابو پا لیا ہے۔ ہم وقت، رفتار اور فاصلے پر حاوی ہو چکے ہیں۔ اب روحانی قوتوں کا زمانہ نہیں، بالکل مادی چیزوں کا تذکرہ ہوتا ہے۔ اور اس لئے مسکراہٹیں بھی مادی ہو گئی ہیں۔ اور جب میری طرف کوئی مسکرا کر دیکھتا ہے تو سوچنے لگتا ہوں کہ اس مسکراہٹ کا کیا مطلب ہے اگر میں بھی مسکرا دوں تو مجھے کیا فائدہ پہنچے گا، اور اگر نہ مسکراؤں تو کیا نقصان ہوگا۔ آج کل ہر چیز نفع اور نقصان کے معیار پر پرکھی جاتی ہے۔ لیکن تمہاری مسکراہٹوں میں وہ بات نہ تھی، اگر ہوتی، تو آج مجھے یوں نہ یاد آتیں تم اسی بات کو ـــ لو کہ صرف ایک مسکراہٹ پر کتنا جھگڑا کیا گیا ہے۔ آج کل تو بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ ہر چیز کا نفسیاتی پس منظر تلاش کرنا پڑتا ہے اور اُس کا اثر اعصاب پر دیکھنا ہوتا ہے، اور پھر تجزیہ۔ اب یہ محبت نہیں ہے محض سر دردی ہے۔ ایک بہانہ ہے اپنے آپ کو ختم کرنے کا لیکن کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا شاید یہ اقدار پرانی اقدار سے اچھی ہیں۔ ہو سکتا ہے۔ اگر ہم ان اقدار کو اپنے آپ پر حاوی ہونے دیں ـــ آہستہ آہستہ عمل پذیر ہونے دیں تو شاید زمانہ بدل جائے۔ اور ہم ایک نئی دنیا بسا لیں۔ لیکن مجھے اس قسم کے روحانی فلسفے سے کوئی سروکار نہیں۔ اور نہ ہی مجھے آج ان S M S ا ـــ پر بحث کرنی ہے کہ کون [illegible] میری مرکزِ نگاہ تو آج تم ہو۔ اور تمہیں بھول کر ان خشک ـــ فلسفوں پر بحث کرنا بے وقوفی ہے۔ شاید [illegible]

رہتا ہے۔ کیونکہ ایک جوتشی نے چند دن گذرے مجھے بتایا کہ میں جلد مر جاؤں گا۔ میں جوتشی کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا، برسوں سے جھوٹ بولنے سے اس کے خد و خال مسخ ہو گئے تھے۔ چہرے پر ایک قسم کی نحوست برس رہی تھی، اور اس پتھریلی سڑک پر بیٹھے ہوئے نہ جانے اُسے کتنے برس ہو گئے تھے۔ اور کون جانتا ہے کہ اس نے کتنوں کے ہاتھ دیکھے اور اُن کی قسمت کا جائزہ لیا۔ کتنوں کو اُس نے امیر بنایا، کتنوں کو اُس نے محبوب کے ملنے کی امیدیں دلائیں۔ کتنوں کو اس نے سمندر پار کی سیر کرائی۔ کتنوں کو اس نے ناامیدی کے کنوئیں میں دھکیلا اور کتنوں کو اس نے اس ناامیدی کو سر کرنے کی ترکیبیں بتائیں لیکن سڑک پر گذرنے والوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ وہ کیوں بیس سال سے اس خاک آلود سڑک پر بیٹھا ہوا ہے۔ جہاں گندگی اور غلاظت کے انبار لگے ہوئے ہیں، اور پسینا کی بُو سے پھیپھڑے جھلس جاتے ہیں۔ کیا ان بیس سال میں اس کی قسمت کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوا۔ کیا وہ ترکیبیں، تجویزیں۔ جو وہ دوسروں کو بتاتا تھا کبھی اس نے اپنے اوپر نہیں آزمائیں۔ کیوں یہ پتھریلی زمین اس کی بنجر زندگی کا ایک اہم جزو بن گئی۔ کیا یہ سڑک یوں ہی پتھریلی رہے گی اور ان سڑک پر چلنے والوں کا ستارہ کبھی بلند نہ ہوگا۔ میں نے چاہا کہ اس جوتشی کو کھری کھری سناؤں، اور اُسے کہہ دوں، کہ وہ کیوں جھوٹ بول کر اپنی روح کو گزند پہنچا رہا ہے۔ لیکن زندگی میں صرف روح ہی ہوتی تو میں اُس سے یہ بات پوچھ لیتا۔ لیکن زندگی میں روح کے علاوہ پیٹ بھی ہے۔ جو روح سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ روحانی تسلی کو خیر باد کہا جا سکتا ہے لیکن پیٹ کی بھوک کو خیر باد کہنا مشکل ہے۔

مگر تمہیں ان جوتشیوں اور راہ گیروں سے کیا واسطہ، یہ لوگ تو ان انسانوں کے لئے وقف ہیں جنہیں اور کوئی کام نہیں ہوتا، تمہیں تو اس زندگی سے بہت سے کام لینے ہیں [illegible]

کا سہارا نہیں۔ تو کم از کم میری زندگی کا انحصار انہی دو چیزوں پر ہے۔ اگر میں تمہیں اپنا نہ بنا سکا تو اس میں تمہاری محبت کا قصور نہیں بلکہ ان حالات کا جن پر میں قابو نہ پا سکا۔ اور اگر حالات پر قابو پا لیتا تو شاید تم آج میری آغوش میں ہوتیں۔ اور مجھے یہ خط لکھنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی۔

. . . .

میں نے تمہیں پہلی بار اس وقت دیکھا جب تم پانچویں جماعت میں پڑھتی تھیں۔ یوں ہی تم ایک دن میرے کمرے میں آ گئیں۔ یونہی نہیں، بلکہ تمہیں ایک کام تھا، اس وقت گو تمہارا قد چھوٹا سا تھا۔ پتلا سا جسم اور خدوخال نہایت تیکھے۔ تمہارے خدوخال نے مجھے بالکل نہیں اکسایا۔ بلکہ اس بے باکی۔ اس بے تکلفی نے جو تم نے میرے ساتھ برتی تم نے بغیر کسی جھجک کے کہہ دیا کہ بہن جی انگلش ریڈر مانگتی ہیں"۔ میں تمہاری صورت کا جائزہ لے رہا تھا تم نے خود ہی الماری کھولی اور کتاب تلاش کرنے لگیں۔ میں تمہاری بے باکی پر اور بھی حیران ہوا۔ تمہارے سر سے دوپٹہ سرک گیا تھا۔ اور تمہارے سیاہ بال میری نظروں میں الجھتے گئے۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے۔ کتنے سیاہ اور لمبے تھے تم نے جلد ہی کتاب ڈھونڈ لی۔ اور پھر چلی گئیں، یہ تھی پہلی ملاقات، کتنی بے جان بے لذت اور فروعی، جس کا ذکر کرنا نہایت فضول لگتا ہے صرف ایک لفظ میں اس ملاقات کے اثر کو بیان کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ تم اس دن نہایت بے باک تھیں، اور تمہارے بال سیاہ اور لمبے تھے، اور دو سال کے بعد جب تم مجھے ملیں تو میں تمہیں پہچان نہ سکا۔ ان دو برس میں تم کیا سے کیا ہو گئی تھیں۔ اس دن مجھے تمہارے بال اچھے لگے تھے، آج تمہارا قد بینج کی طرح لانبی اور نازک اندام، میں نے سرو سے اس لئے تشبیہہ نہیں دی۔ کہ یہ تشبیہہ پرانی ہو چکی، اور زیادہ استعمال سے اس لفظ کی خوبصورتی مٹ چکی ہے بینج کا درخت تم نے نہیں دیکھا ہوگا۔ کیونکہ شہروں میں بینج کے درخت نہیں ہوتے، سرو بہت ہوتے ہیں اور میں تمہارے تصور کو بہت دور لے جانا چاہتا ہوں تاکہ اس شادی کے ماحول سے نکل کر تم چند ساعتوں کے لئے اس

دنیا میں آ جاؤ۔ جہاں میں سانس لے رہا ہوں تاکہ تم بھی میری طرح ماضی کے واقعات سے لطف اندوز ہو سکو تم اگر اکیلی ہوتیں تو تو میں تمہیں زیادہ انہماک سے دیکھتا اور ایک نقاش کی حیثیت سے تمہارے خدوخال کا جائزہ لیتا لیکن تمہارے ساتھ ایک اور بھی لڑکی تھی۔ جس کا حسن صبیح تمہاری خوبی پر حاوی ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ہوا چہرہ، غلافی آنکھیں اور رس بھرے ہونٹ تمہارے لمبوترے چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں اور پتلے پتلے ہونٹوں کے مقابلے میں زیادہ اچھے لگے۔ تم اس دن شرم وحیا سے سمٹی ہوئی تھیں اور وہ زیادہ بے باک نظر آ رہی تھی۔ اسے اپنے جسمانی حسن کا احساس تھا اسی لئے تو وہ اٹھلا اٹھلا کر چلتی تھی۔

اور اس کا بھرا ہوا سینہ مجھے زیادہ پسند آیا۔ جس میں شباب کی ساری تازگی پنہاں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوانی ایک سیل آتشیں کی صورت میں ان بلندیوں کے نیچے کروٹیں لے رہی ہے۔ اور یکایک اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس مشینی دور میں بھی عورت کا شباب زندہ ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک، اس شباب میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ انسانوں کی حرکات، سکنات، ان کا نصب العین، ان کی معاشرت ان کی اخلاقی، سیاسی قدریں بدلتی رہی ہیں لیکن عورت کا شباب اسی شدت سے محسوس کیا جاتا ہے، صدیوں کا آہنی چکر شباب کی رعنائیوں، لطافتوں، اور کیفیتوں کو نہیں کچل سکا۔ اب بھی بیسویں صدی میں ایک مرد ایک عورت کے لئے پاگل ہو سکتا ہے، ایک عورت کے لئے تخت وتاج چھوڑ سکتا ہے،

لیکن تمہاری سہیلی کو اس بات کا احساس نہ تھا، کہ اس کا حسن اتنے تباہ کن نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ وہ ایسے چلتی تھی گویا اسے لوگوں کی کوئی خاص پروا نہ تھی، اگر لوگوں کی نظریں اس کے سینے پر پڑتی تھیں تو پڑتی رہیں، اور اگر اس کا کرتا ضرورت سے زیادہ ابھرا ہوا ہے۔ تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اور تم ـــ تمہارا قد لمبا تھا۔ اور جسم پتلا سا نرناری کی بیل کی طرح لچکتا ہوا۔ اور پھر تم کچھ حد سے زیادہ شرمیلی ہو گئی تھیں۔ تمہارے چلنے کا انداز نہایت ہی بھدا تھا، گردن نیچے کر کے کبھی کبھی مڑ کر دیکھنا کبھی چھپ کر کنکھیوں سے

کبھی لبوں پر مسکراہٹ ہے تو کبھی لب جامد ہیں۔ کبھی تمہارا سر ملتا تھا تو کبھی ہاتھ ہلا کر اپنی سہیلی کے ساتھ کھسر پھسر کرنا۔ اور اس کے ساتھ لپٹ لپٹ کے چلنا۔ مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا۔ اور جب تم گلی کے موڑ پر پہنچیں تو تم نے مجھے ہاتھ سے نمستے کی۔ مجھے امید تھی کہ تم اس طرح کرو گی۔ تم جیسی لڑکیاں نہایت ہی جذباتی ہوتی ہیں۔ تم پوچھ سکتی ہو کہ مجھے کیونکر معلوم ہوا کہ تم ایسا ہی کرو گی محض تجربے کی بنا پر۔ مجھے معلوم ہے جو لڑکی زیادہ شرمیلی اور خاموش ہوتی ہے۔ وہ اکثر تصور کی دنیا میں ڈوبی رہتی ہے۔ اُسے خود نمائی کی زیادہ ضرورت نہیں ہوتی۔ اس کے خیالات زیادہ حسین اور رنگین ہوتے ہیں لیکن جو لڑکی زیادہ ہنستی ہے، جسے اپنے حسن کا ضرورت سے زیادہ احساس ہے، وہ جذباتی کم ہوتی ہے۔ اور کاروباری زیادہ ایسی لڑکیاں اشارے کم کیا کرتی ہیں۔ خط کم لکھتی ہیں۔ شاید وہ سمجھ جاتی ہیں کہ آخر انہیں ایک دن شادی کرنی ہے تو پھر ان جھنجھٹوں سے کیا حاصل۔ ان اشاروں اور خطوں سے کیا ملے گا۔ چھپ چھپ کر ملنا۔ مڑ مڑ کر دیکھنا۔ نگاہوں سے مسکرانا۔ ایسی باتیں انہیں فضول لگتی ہیں۔ وہ جی بھر ہنس لیتی ہیں، وہ مردوں سے کم ڈرتی ہیں۔ اور شرم۔ ڈر۔ اور جھجک کے خلاف کی پناہ نہیں لیتیں۔ اُن کی جنس کا اظہار اُن کی خود نمائی میں ہوتا ہے۔ اور شاید یہ طریقہ دوسرے طریقوں سے بہتر ہے۔ لو ـــــ میں پھر نفسیاتی چکّر میں اُلجھ گیا مجھے اس سے کیا۔ کہ فلاں عورت جذباتی ہے۔ فلاں نمائش پرست ہے یا فلاں عورت ایسی ہو سکتی ہے یا ہو جائے گی۔ ان باتوں کے لئے میرے پاس وقت نہیں تو ہاں! اس ملاقات کے بعد تمہاری عادات بدل گئیں، مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے تم نے اپنے آپ کو اور زیادہ سکیڑ لیا ہے۔ بالکل لاجونتی کی بیل کے پتوں کی طرح، جو ذرا سے لمس سے سکڑ جاتے ہیں۔ اگرچہ تمہارا قد لمبا ہوتا جا رہا تھا۔ اور تمہاری آنکھوں میں ایک نئی چمک پیدا ہو رہی تھی لیکن تم ضرورت سے زیادہ گھٹی گھٹی نظر آنے لگیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ تمہارے ذہن پر ایک بوجھ سا ہے۔ جس کا احساس تمہیں نہایت شدت سے ہو رہا ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ گھر والوں کے ساتھ تمہارا کیا رویہ تھا۔ شاید تم گھر میں ہنستی ہو گی کھل کر باتیں کرتی ہو گی لیکن میں کامل وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات کے بعد جب بھی تم مجھے گلی میں ملیں تو تم مجھے دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اور پھر مجھے دیکھ کر بھاگ گئیں۔ اور ایک دن میں نے تمہارا تعاقب بھی کیا کہ معلوم کروں تم مجھے دیکھ کر کیوں بھاگتی ہو لیکن کسی نتیجہ پر نہ پہنچ سکا تم نے دو تین بار اس طرح کیا۔ اور میں بہت سٹ پٹایا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے۔ تمہاری یہ حرکتیں کیا معنی رکھتی ہیں۔ ان چند مہینوں میں کیا کچھ ہو گیا کہ تم مجھے دیکھ کر ٹھٹھک جاتی یا پھر جلدی سے بھاگ جاتی ہو۔ اور پھر ایک دن عقدہ کھلا جب ماں نے مجھ سے کہا کہ بڑے چودھری کے گھر سے سگائی کے لئے کہہ رہے ہیں۔ تمہاری کیا رائے ہے۔" پھر میں سمجھ گیا تم کیوں جھینپ جاتی ہے۔ اور مجھے دیکھ کر گھبرا جاتی ہو۔ اور میری نظروں سے فوراً اوجھل ہو جاتی ہو۔ تمہارے حسنِ تخیل کی میں داد دیتا ہوں کہ منٹوں ہی منٹوں میں تم مجھے کہاں سے کہاں لے گئیں۔ اماں نے پھر پوچھا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ ان کا مطلب تھا کہ میں ہاں کر لوں۔ میں ان دنوں بی اے فیل ہو چکا تھا۔ اور اپنے چچا کی دُکان پر بیٹھا کرتا تھا۔ میرے چچا شہر کے مشہور ڈاکٹر تھے، اور ان کی یہ رائے تھی کہ میں بھی اس دُکان پر کام کروں۔ اور اس طرح ڈاکٹری سیکھ لوں۔ اور پھر اس شہر میں ڈاکٹری کی دُکان کھول لوں۔ تجویز کتنی معقول تھی لیکن مجھے بالکل ناپسند تھی۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھے عطائیوں سے نفرت ہے گو میں یہ بات جانتا ہوں کہ اگر میں ڈاکٹری سیکھ لیتا تو اس وقت تک کافی روپے کما لئے ہوتے ڈاکٹر گردھاری لال اور ڈاکٹر تارا سنگھ، دونوں نے میرے سامنے ہی پریکٹس شروع کی دونوں نے ڈاکٹری کا امتحان کہیں سے بھی پاس کیا تھا لیکن جاہل لوگوں کو جاہل تر بنانا کوئی مشکل کام نہیں۔ چند دوائیں ایک چھاتی دیکھنے کا آلہ اور تھرمامیٹر خرید کر انسان ایک مکمل ڈاکٹر بن جاتا ہے اور اس کے بعد وہ مریضوں کو چاہے جہنم میں بھیجے یا جنت میں لیکن مجھے یہ طریقے پسند نہیں۔ میں ہر چیز کو مکمل طور پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس لئے میں نے ڈاکٹر بننے کا خیال ترک کر دیا لیکن تمہارے والد کا اصرار بڑھتا گیا۔ اور وہ سگائی پر زور دینے لگے۔ تمہارے پیغام بھی مجھ کو ملتے رہتے تھے۔ اور جو کچھ تم نے اپنے رشتہ دار لڑکی نے کہلوایا، وہ بھی مجھے یاد ہے، ان سے کہو کہ وہ سگائی کر لیں۔ میں اس بے باکی کی داد دیتا ہوں، کہ تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے منتخب کر

لیا۔ اور تم نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ سگائی ہو جائے اور آخر یہ باتیں شہر میں پھیل گئیں اور شہریوں کی زبان پر چرچا ہونے لگا۔ اس چھوٹے شہر میں تمہارے والد کا کافی رسوخ تھا۔ اس لئے اس بات نے کافی اہمیت اختیار کر لی اور اکثر دوستوں نے مجھ سے کہا بھئی! سنا ہے، تمہاری سگائی ہو گئی ہے۔ بھئی! خوب ہے، اچھی نبھے گی۔ میرے دوستوں نے تمہیں اکثر دیکھا ہوگا۔ اور تمہارے حسن کی بے باکیوں نے انہیں پریشان بھی کیا ہوگا۔ اُن کے تعریفی فقرے جو وہ ہم دونوں پر کستے تھے، ان میں اُن کی اپنی جنسی بھوک کا وحشیانہ اظہار تھا۔ اب تم نے ہمارے گھر آنا بند کر دیا۔ کیونکہ ماں نے ہاں کر دی تھی۔ اور تمہیں اس بات کا پورا یقین ہو گیا تھا کہ اب تمہاری شادی اسی گھر میں ہوگی۔ تمہارے پیغام میرے پاس پہنچتے تھے "گھر کا دروازہ ذرا اونچا کرا لو۔ میں روز بروز لمبی ہوتی جا رہی ہوں"۔ "پرسوں آپ نہایت ہی میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے"۔ "آپ کو اچکن اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے سر کے بال بہت بڑھے ہوئے تھے۔ کیا شہر میں نائی کوئی نہیں"۔ "آپ نے میری طرف دیکھا نہیں۔ اور برابر قریب سے گذر گئے"۔ "میں اکثر شام کے جھٹپٹے گلی والے درخت کے قریب کھڑی ہوتی ہوں۔ اور اپنی سہیلیوں سے باتیں کرتی ہوں تم بھی اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں سے گذرا کرو"۔ اور اس طرح کئی اور احکام جو میں کبھی نہ بجا لا سکا۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مجھے کچھ اس قسم کے عشق سے نفرت ہو گئی ہے۔ گو میں سمجھتا ہوں۔ کہ تمہارے لئے یہ بات نئی تھی۔ بالکل نئی۔ کیونکہ تمہارے جسم کی تشکیل یہ ظاہر کر رہی تھی کہ یہ جوش بالکل نیا ہے۔ یہ ابال شاید پہلا اُبال ہے۔ اُس کی اٹھان ہی نرالی ہوتی ہے۔ اور انسان اس حالت میں اتنا بے قابو ہو جاتا ہے کہ اُسے اونچ نیچ کی پروا نہیں رہتی۔ اگر میری بھی یہ اولیں محبت ہوتی۔ تو شاید میں بھی ایسا ہی کرتا۔ اور ہم دونوں نہ جانے کیا کر بیٹھتے، لیکن میں اس سے پہلے ایک عورت سے محبت کر چکا تھا اور وہ بھی ایک شادی شدہ عورت سے۔ اگرچہ یہ تم پڑھ کر ہنسو گی کہ ایک مجرد انسان ایک شادی شدہ عورت سے کیونکر محبت کر سکتا ہے۔ تمہاری طرح میرے دوست بھی مجھ پر ہنستے ہیں۔ ہندوستان میں محبت کی قدریں ابھی پرانی ہیں۔

یہاں ایک شادی شدہ عورت کی طرف دیکھنا ایک فعل بد سمجھا جاتا ہے سماج کہتا ہے۔ وہ عورت تو دوسرے کی ہو چکی۔ اب تمہارا اس پر کیا حق ہے۔ اب تم اس کی طرف کیوں دیکھتے ہو۔ شادی شدہ عورت کی شخصیت تو ایک شخص کی ملکیت ہو چکی۔ اب تم کیوں جھک مارنے پر تلے ہوئے ہو۔ لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے اس عورت سے محبت تھی۔ اور اس کے بعد آج تک کسی اور سے محبت نہ کر سکا۔ اگر تم اس عورت کو دیکھتیں تو اُسے دیکھ کر منہ پھیر لیتیں، وہ خوبصورت نہ تھی، لیکن میں نے اُس سے جی بھر کر محبت کر لی۔ یہ میرے شباب کا اولین عکس تھا۔ جس شدت سے میں نے اس عورت کو چاہا، وہ گرمی، وہ تڑپ وہ اضطراب میرے جسم، میری روح میں پھر کبھی نہ آ سکا۔ یہ ایک لمبی سرگذشت ہے۔ جس کا انجام نہایت بھیانک ہے اس عورت کے لئے میں بہت بدنام ہوا اور اُسے بھی میرے لئے کافی ذلت اٹھانی پڑی۔ پانچ سال ہوئے وہ مر گئی۔ لیکن اُس کی یاد ابھی تک زندہ ہے۔ اُس کی محبت کی تپش باقی ہے جس سے میں اکثر بے چین ہو جاتا ہوں ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ جس طرح تم اپنے آپ کو میرے لئے پریشان کرتی رہی ہو۔ اسی طرح میں اپنے آپ کو اس عورت کو پانے کے لئے پریشان کرتا رہا۔ میں تو خیر بامراد رہا۔ مگر تم میرے ہاتھوں کے لمس سے بیگانہ رہیں۔ لیکن محبت اور شادی میں فرق ہے۔ میں اس عورت سے محبت کر سکتا تھا۔ شادی نہیں۔ اور تمہارے ساتھ میں شادی کر سکتا تھا۔ لیکن محبت نہیں۔ میں نے کوشش کی کہ میں تم سے محبت کر سکوں لیکن ایسا نہ کر سکا۔ اکثر تمہارے خدوخال میری آنکھوں کے سامنے آ جاتے اور میں نہایت باریکی سے اُن کا تجزیہ کرتا۔ اور اُن میں طرح طرح کے نقص نکالتا۔ اور سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا۔ اگر تمہاری آنکھیں بڑی بڑی ہوتیں۔ اور تمہاری ٹھوڑی ضرورت سے زیادہ لمبی نہ ہوتی، اور اگر تمہارا نچلا ہونٹ ذرا موٹا ہوتا، تو زیادہ خوبصورت ہوتا۔ اور اگر تمہاری آنکھوں کی پلکیں زیادہ گھنی ہوتیں، تو تمہاری آنکھوں کی چمک زیادہ نمایاں ہو جاتی۔ اور پھر تم نہایت بے ڈھنگے پن سے لمبی ہوتی جا رہی تھیں۔ کولھوں اور کمر میں کوئی تناسب نہ تھا، اگر کمر پتلی تھی تو کولھے متناسب نہ تھے۔ اور باقی جسم پر بھی اتنا

گوشت نہ تھا کہ تمہارے اعضا زیادہ متناسب ہو جاتے ۔ اس قسم کے گھناؤنے خیال جو شرافت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں رکھتے مجھے ستایا کرتے ۔ اس عمل کو روکنا میرے بس میں نہ تھا لیکن ان خامیوں کے باوجود تم میں جاذبیت تھی اتنی جاذبیت کہ میں تم سے شادی کر سکتا تھا لیکن محبت نہیں، محبت کے لئے کچھ اور چاہئے۔ ایک خاص قسم کا حسن، ایک قسم کا ــــ کیا کہوں۔

تم تو مجھے پسند تھیں، صرف پسند میں نہیں پسند کر سکتا تھا اور تمہیں پسند کرتا ہوں، اور شادی بھی کر لیتا ۔ اگر حالات اجازت دیتے ۔ ہاں حالات ــــ شاید تم ہنس دو ۔ اور کہو کہ ہندوستان میں ہر انسان شادی کر لیتا ہے ۔ خواہ اس کے حالات اچھے ہوں یا بُرے ۔ شادی تو اُن کے لئے اتنی ہی ضروری چیز ہے جتنی کہ موت ۔ لیکن زندگی میں موت گوارا نہیں کی جا سکتی ــ میرے تمام دوستوں نے شادیاں کر لی ہیں، گو اُن کے اقتصادی حالات مجھ سے بہتر نہ تھے، تو کیا میں شادی نہ کر سکتا تھا ۔ اب تو میں نے بی اے بھی کر لیا تھا، اور اگر چاہتا، تو کسی بنک، یا گورنمنٹ کے محکمہ میں ملازم ہو جاتا ۔ اور تمہارے دل کی آرزوؤں کو پورا کر دیتا، لیکن میں ان چیزوں سے بہت گھبراتا ہوں، تمہارے والد نے مجھے سگرٹوں کی ایجنسی لینے کو کہا تھا کہنے لگے، سگرٹوں کی ایجنسی میں بہت فائدہ ہے ۔ گورنمنٹ کی نوکری میں کیا دھرا ہے ۔ یہ ایجنسی لے لو ۔ اور کام کرتے جاؤ، ساری دنیا سگریٹ پیتی ہے ۔ اور خاص کر اس شہر کے لوگ تو سگریٹ اور نسوار کا خوب استعمال کرتے ہیں ۔ اور اگر ایجنسی کے ساتھ نسوار کا ٹھیکہ بھی لے لو ۔ تو وارے نیارے ہو جائیں گے چند ہی برس میں میری طرح ایک عالی شان مکان بنا لو گے، اور لڑکوں اور بچوں کے درمیان ایک باعزت انسان بن جاؤ گے سگریٹ کی ایجنسی اور ــــ نسوار ــــ، نسوار سے مجھے نفرت ہے ۔ لیکن میں سگریٹ خود پیتا ہوں، اور جب کبھی حد سے زیادہ مغموم ہو جاتا ہوں تو کمرے میں بیٹھ کر سگریٹ کا دھواں فضا میں بکھیرتا رہتا ہوں فضا میں دھواں پھیلتا رہتا ہے بکھرتا رہتا ہے ۔ اور میرے پریشان، آوارہ خیالات، دھوئیں کی سفید سفید لہروں میں تحلیل ہوتے رہتے ہیں کچھ اسی طرح مجھے تسکین ہو جاتی ہے ۔ یونہی چھوٹی سی فروعی باتوں سے تسکین ہو جاتی ہے ۔ نہ جانے کیوں لیکن ایجنسی لینے سے تو رہا ۔ نسوار ــــ توبہ ــــ توبہ ۔ مکان بنانے کی خواہش نہیں ۔ اور باعزت انسان بننا میں نے کبھی قبول نہ کیا ۔ ان دنوں میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ میں کیا کر سکتا ہوں ۔ اور کیا کروں گا، ایک بے کیف سی آوارگی میرے دل و دماغ میں بسی رہتی، کوئی چیز پسند نہ آتی تھی ۔ دکان پہ کام کرتے کرتے میں تنگ آ گیا تھا جی چاہتا تھا کہ شہر چھوڑ کر بھاگ جاؤں ۔ آخر میں کیا چاہتا ہوں ۔ اس کے متعلق میں سوچتا رہتا ۔ کاش میں کہیں کلرک ہی بھرتی ہو گیا ہوتا ۔ اور ساٹھ روپے ماہوار لے کر تم ــــ سے شادی کر لی ہوتی ۔ اور ان چھ سالوں میں کم از کم چھ بچے پیدا کئے ہوتے ۔ شاید مجھے تسکین ہوتی ۔ اور لوگوں سے کہہ سکتا کہ میں نے بھی دنیا میں کچھ کام کیا ہے ۔ آخر میں اپنے دوستوں کے نقش قدم پر کیوں نہ چلوں ۔ اگر انہیں حق حاصل ہے کہ وہ ہر سال ہندوستان کی آبادی میں ایک فرد کا بغیر سوچے سمجھے اضافہ کر دیں، تو میں کیوں دریا کے کنارے پر کھڑا رہوں، کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لوں، لیکن میں ایسا نہ کر سکا ۔ اور میں اکثر سوچتا رہتا کہ میں کیا چاہتا ہوں میں کیوں پریشان ہوں اور آہستہ آہستہ مجھ پر یہ بات آشکار ہونے لگی کہ مجھے کلرکی سے نفرت ہے، مجھے ان ساٹھ روپوں سے نفرت ہے مجھے ان بچوں سے نفرت ہے ۔ مجھے اس گھٹے ہوئے ماحول سے نفرت ہے مجھے ان چھوٹے چھوٹے مکانوں سے نفرت ہے مجھے انسانوں کی کمینگی سے نفرت ہے یہ کیوں ہر طرف غلاظت سی غلاظت نظر آتی ہے ۔ کیوں ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہوتا ہے ۔ چھتوں پر اندھیرا ۔ برتنوں پر اندھیرا ۔ چولھے پر اندھیرا ۔ روٹیوں پر اندھیرا ۔ اور آہستہ آہستہ یہ اندھیرا پھیلتا جاتا ہے ۔ کائنات کے ہر ذرے ذرے پر چھائے جاتا ہے ۔ انسان کے ریشے ریشے میں سمائے جاتا ہے ۔ آہستہ آہستہ مجھے اس نظام سے نفرت ہونے لگی، جہاں اس قسم کا اندھیرا پھیلا رہتا ہے، کیوں نہ میں اس اندھیرے کو چیر دوں اس اندھیرے کی قبا کو پھاڑ دوں، تاکہ روشنی کا منبع اعظم

پھوٹ پڑے، کم از کم ان چھوٹے مکانوں میں روشنی تو آجائے۔ ان چھوٹے کمروں میں جہاں ایک جگہ میاں بیوی اور بچے ہوتے ہیں روشنی آجائے۔ جہاں مہینے میں ساٹھ روپے ملتے ہیں۔ اور کھانے والے افراد آٹھ ہوتے ہیں۔ جہاں شادی کے بعد عورتیں جلد بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں اُن کی آنکھوں کی چمک اتنی جلد غائب ہو جاتی ہے۔ اور اُن کی ملائم مخروطی انگلیاں برتن صاف کرتے کرتے ٹیڑھی ٹیڑھی ہو جاتی ہیں۔ جہاں اُن کے چہرے کی ہڈیاں باہر نکل آتی ہیں۔ اور ہڈیوں پر چمڑا اتنا سخت اور کھردرا ہو جاتا ہے کہ دیکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ جہاں اُن کے گالوں کے گڑھے اتنے گہرے ہو جاتے ہیں کہ ان میں جنسی بھوک کسی چھپکلی ہوئی چمگادڑ کی طرح کراہتی رہتی ہے۔ وہ سیاہ بال جن پر اس کا خاوند جان چھڑکتا تھا۔ آج کیوں بوٹ پالش کے برش کی طرح خشک اور کھردرے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں کی تابانی کہاں گئی۔ وہ میٹھی شہد جیسی آواز کدھر غائب ہو گئی۔ اور انسان کیوں گنوار اور حیوان بن جاتے ہیں۔ بے روح۔ صرف چلتی پھرتی ٹانگیں اور ان پر کپڑوں کے خول۔ اور اندر کچھ بھی نہیں دکھائی نہ دینے والا انسان۔ اور آہستہ آہستہ یہ حقیقتیں میرے لئے بارگراں ہو گئیں۔ دل میں اس نظام کے خلاف ایک نفرت کا جذبہ ابھرنے لگا۔ لیکن اس دوران میں چند لمحے ایسے بھی آئے۔ کہ میں اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔ تمہاری یاد کا جال آہستہ آہستہ مضبوط ہو رہا تھا۔ اور اس شہر میں رہتے ہوئے یہ ناممکن تھا کہ میں تمہیں بھول جاتا یا نظر انداز کر دیتا۔ تمہاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچتیں تم اکثر مجھے کہیں نہ کہیں مل جاتیں کبھی کبھی اپنے نوکر کے ساتھ، کبھی سہیلیوں کے ساتھ۔ اور کبھی اپنی اماں کے ساتھ۔ تمہاری آنکھوں کا حزن و ملال تمہاری نگاہوں کی ذرا سی جنبش مجھے کبھی کبھی پریشان کر دیتی۔ اور پھر تمہارے والد نے کچھ عرصے سے مختلف تحائف ہمارے گھر بھیجنا شروع کر دیئے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ سگائی کی بات پکی ہو گئی۔ لیکن میں جانتا تھا کہ یہ کام ہونے والا نہیں۔ گھر والے اکثر مجھے نوکری کے لئے مجبور کرتے۔ لیکن میں گھر والوں کو یہ کہہ کر ٹال دیتا۔ کہ نوکری ابھی ملتی نہیں۔ اور اس طرح آنے والے خطرے کو ٹالتا رہتا۔

آخر تمہارے والدین نے تنگ آکر مجھ سے پوچھ ہی لیا" کہ میری کیا رائے ہے"۔ کب تک شادی کرنے کا ارادہ ہے"۔ پہلے پہل میں نے سوچا کہ میں انہیں گول مول جواب دے دوں کیونکہ کیونکہ میں تم سے رشتہ ناطہ توڑنا نہ چاہتا تھا۔ کون چاہتا ہے کہ اس سنہری جال کو توڑ دیا جائے۔ جس میں آرزوؤں۔ تمناؤں، اور خواہشوں کا تانا بانا لگا رہتا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا تھا کہ تم میرا کورا جواب سن کر مجھ سے روٹھ جاؤ۔ اور میں تمہاری مسکراہٹوں سے اتنی جلدی محروم ہو جاؤں۔ تمہاری نگاہوں کی نوازش سے محظوظ نہ ہو سکوں۔ تمہاری باتیں اکثر مجھ تک پہنچ جاتی تھیں۔ جن سے میرے جذبۂ مردانگی کو کچھ تقویت ملتی تھی۔ لیکن میں یہ بھی نہ چاہتا تھا کہ تمہارے والدین کو ہمیشہ کے لئے تاریکی میں رکھوں اگر میں شادی نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم ہندوستان میں اور نوجوان موجود ہیں۔ جو تمہارے ہونٹوں کو چومنے کے لئے بے قرار ہیں۔ اس لئے میں نے تمہارے والد سے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک میں اپنے لئے کوئی اچھا سا کام نہ تلاش کر لوں شادی نہیں کروں گا تمہارے والد نے کہا شادی کر لو۔ اور شادی کے بعد لڑکی ہمارے گھر رہے گی اور جب تک تم کسی اچھے عہدے پر فائز نہیں ہوتے، لڑکی کے اخراجات کے ہم ذمہ دار ہوں گے"۔ تجویز کتنی معقول تھی کہ خرچ تو تمہارے والد کریں۔ اور بچے میں پیدا کرتا جاؤں۔ لیکن یہ کب تک ہو سکتا تھا آخر ایک نہ ایک دن مجھے اپنے بچوں کا باعزت باپ بننا پڑے گا۔ میرا ضمیر اس ذلت کو برداشت نہ کر سکا۔ کیونکہ اس نظام میں ایک اچھی جگہ حاصل کرنا ایک اہم سر کرنا ہے اور چونکہ میں نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ اور طبقاتی کشمکش کی بہیمیت اور شقاوت ہر روز بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ ہر ایک شخص دوسرے کا گلا گھونٹنے کے لئے تیار ہے۔ اور اگر متوسط طبقہ کا کوئی فرد اس خلیج کو پاٹنا چاہے، یا یہ کوشش ہی کرے، تو اس کے ساتھی ہی اس کی ٹانگ کھینچتے ہیں۔ اور عرشی طبقے والے لوگ کب یہ گوارا کرتے ہیں کہ کوئی زمینی آدمی اُن کے محلوں میں قدم رکھ سکے۔ اور اس کرب انگیز کشمکش میں وہ انسان نہیں رہتا۔ ایک بے روح، بے جان لوتھڑا بن جاتا ہے۔ اور مجھے تو اس

روشنی کے مینار کو پانے کے لئے کافی جدوجہد کرنی تھی۔ میرے پاس کسی بڑے آدمی کی سفارش نہ تھی۔ رشوت اور تحفوں کے لئے اتنا روپیہ نہ تھا۔۔۔ . . . .

۔۔۔ اور انگلینڈ سے کوئی ڈگری لے کر بھی نہ آیا تھا، کوئی رشتہ دار کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہ تھا تو ان حالات میں کس طرح ایک اچھی جگہ حاصل کر سکتا تھا۔ صرف کلرکی اپنا منہ کھول رہی تھی۔ اور وہ بھی ساٹھ روپلوں کی کلرکی، جو آج کل جنگ کے زمانے میں ٹکے سیر بکنے لگی ہے، اور پھر پڑھا لکھا نوجوان کلرک بن کر اپنے آپ کو افلاطون سمجھتا ہے، اور بچے پیدا کرنے سے ذرا نہیں جھجکتا اور کبھی کبھی تمہاری سنہری آرزوؤں کا جال میرے قریب آ جاتا تو میرے صبر کے بند ٹوٹ جاتے اور میں سوچتا کہ مجھے کیا غرض ہے کہ میں اپنے آپ کو یوں برباد کروں۔ ازل سے لے کر ابد تک یہ اندھیرا چھایا ہوا ہے اور آج تک کوئی شخص اس اندھیرے کو دور نہ کر سکا بلکہ یہ اندھیرا دن بدن زیادہ گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ اور میں اس روشنی کے مینار کو پانے کی بے سود کوشش کر رہا ہوں۔ کیوں نہ میں اپنے آپ کو اس اندھیرے کے وسیع اور بے پایاں سمندر میں پھینک دوں اور ہمیشہ کے لئے اس میں غرق ہو جاؤں، اور پھر اس اندھیرے میں تمہارے ہونٹ چمکنے لگتے۔ تمہارے گال تمتمانے لگتے۔ تمہارے لانبے بال سر سے لے کر پاؤں تک چھا جاتے تمہاری آنکھوں میں سنہری آرزوئیں ناچنے لگتیں۔ اور میں تمہیں پکڑنے کی کوشش کرتا، تاکہ تمہارے سیاہ بالوں میں اپنے آپ کو چھپا لوں۔ اور تمہاری آتشی خواہشیں مجھے چاروں طرف سے گھیر لیں، اور ہم دونوں اس اندھیرے سمندر میں باقی انسانوں کی طرح لڑھکتے رہیں۔ کم از کم تمہارے ہونٹوں کا لمس مجھے ہمیشہ کے لئے ان اقتصادی جھنجھٹوں سے آزاد کر دے گا لیکن میں نے سگریٹوں کی ایجنسی سے شادی کرنا گوارا نہ کیا، جاہل!

شاید مجھے عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے کی کبھی آرزو نہیں ہوئی بلکہ مجھے ان لوگوں سے نفرت سی ہو گئی ہے۔ اور اس طرز بود و ماند سے۔ اس معاشرت سے۔ اس تہذیب و تمدن سے میں روشنی کے مینار کو پانا چاہتا ہوں اور اس کی نورانی کرنوں کو دنیا میں بکھیرنا چاہتا ہوں، تاکہ اس پھیلے ہوئے بے پایاں اندھیرے میں کچھ کمی ہو جائے لیکن آج تک روشنی کے مینار کو کون پا سکا ہے۔ یہ سرمایہ دار قومیں ہمیں اس روشنی کے مینار کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیتیں۔ میں یونہی اس بحث میں پڑ گیا۔ جیسے لوگ سرمایہ دار نظام کو نہیں سمجھتے۔ ان باتوں سے کچھ بنتا ہے اور ناحق میں اپنے دماغ کو پریشان کر رہا ہوں۔ اب تم شوہر والی ہو، ایک بچے کی ماں ہو۔ اور تمہارا گھر ہے۔۔۔۔

اور معلوم نہیں تم کیا ہو۔ اور کیا ہو جاؤ گی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمہارا شوہر لوہے کا بیوپار کرتا ہے۔ آج کل لوہے کی اشد ضرورت ہے اور لوہے کی قیمت تو سونے کے برابر ہے۔ آج کل تمہاری چاندی ہے۔ کہاں سرمایہ دار نظام کی باتیں، اور کہاں لوہا اور سونا در اصل ہماری ذہنیت بھی سرمایہ دارانہ ہو گئی ہے۔ ہم خطوں میں بھی ان چیزوں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ خیر چھوڑو۔ ان باتوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوا۔ تم جانتی بھی ہو۔ تم نے میرا انتظار کیا۔ ایک سال دو سال تین سال۔ شاید کہیں نوکری مل جائے۔ لیکن میں نوکری کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے نوکری کہاں ملتی۔ آخر تمہارے والدین نے تنگ آ کر تمہارے لئے پھر بر، ڈھونڈنا شروع کیا۔ اور میں اس دوران میں تمہارے ملنے سنتا رہا۔

اور آخر تم کب تک میرا انتظار کرتیں۔ ہر فرد ایک آسودہ زندگی گزارنا چاہتا ہے، تو پھر تمہیں بھی حق تھا کہ تم اپنے رویے کو بدل دیتیں اور اپنی زندگی ایک نئے قالب میں ڈھالتیں، اور پھر ایک دن تمہاری برات آ گئی۔ میں اس دن اس شہر میں تھا۔ تمہارے والد نے مجھے مدعو نہ کیا۔ شاید یہ ناراضگی کا اظہار تھا کہ میں نے کیوں شہر کے ایک بڑے آدمی کی بات نہ رکھی، اور ناطہ توڑ دیا۔ تم جس طرح مجھے بھول گئیں میں اس کی تعریف کرتا ہوں، اور جس خوشی سے تم نے اپنے خاوند کے گلے میں ہار ڈالا۔ اس کی بھی داد دیتا ہوں۔ تمہاری سہیلیوں نے مجھے بتایا کہ تم بہت خوش تھیں۔ یہ باتیں سن کر مجھ کو صدمہ ہوا لیکن تمہاری اس نئی روش نے مجھے ذہنی تقویت بھی دی۔ زندگی کے ایک نئے زاویے سے آگاہ کر دیا۔

تم نے میری یاد کو دل و دماغ سے اس طرح خارج کر دیا

جس طرح ایک نئی دلہن شادی کے چند مہینوں کے بعد اپنا لال جوڑا اتار پھینکتی ہے۔ مجھے معلوم ہے تم ہنستی کھیلتی اپنے خاوند کے ساتھ چلی گئیں تم مجھے پیرپور کے اڈے پر ملیں۔ جب تم گونے کے بعد واپس آ رہی تھیں۔ تمہارا خاوند تمہارے ساتھ تھا۔ وہ کچھ وجیہہ نہ تھا یہ محسوس کر کے مجھے خوشی ہوئی کم از کم وہ مجھ سے زیادہ خوش شکل نہ تھا۔ بلکہ میں تو نہایت فراخ دلی سے اسے بدصورت کہہ سکتا ہوں لیکن تم خوش تھیں۔ تم نے ایک نہایت قیمتی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا روپہلی کنارہ تمہارے سیاہ بالوں کو چوم رہا تھا، تمہارے چہرے کا صرف ایک حصہ مجھے دکھائی دیتا تھا۔ اس لئے میں تمہاری خوشی اور انبساط کا پورا اندازہ نہ کر سکا۔ تم نے مجھے دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں۔ اور جوار کے لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھنے لگیں اور پھر لاری چل پڑی۔ تم نے شادی کر کے اس گھریلو زندگی کو اچھی طرح دیکھ لیا ہوگا۔ یہ زندگی کوئی اتنی اچھی نہیں اس میں کوئی خاص جاذبیت نہیں۔ ساس اور نند کے جھگڑے۔ ساس اور بہو کے جھگڑے۔ خاوند اور بیوی کے جھگڑے۔ اور پھر اقتصادی جھگڑے۔ مزاج کی ناموافقت اور طرح طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ لیکن تم ایک ہندوستانی عورت ہو اور ہندوستانی عورت کے لئے شادی ہی زندگی کا سب سے بڑا عطیہ ہے اور اسی لئے تم نے اس زندگی کو اپنا لیا ہوگا۔ نہیں تو۔ اس کے سوا اور کیا چارہ ہے

میں ابھی تک اکیلا ہوں، بالکل اکیلا اور تنہا، اور دن اور رات روشنی کا مینا میری آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا ہے۔ میں اسے چھو نہیں سکتا۔ اس تنہائی میں تم کبھی کبھی یاد آ جاتی ہو، صرف تم ہی نہیں بلکہ کچھ اور عورتیں، جن سے میں محبت کر چکا ہوں، اب ان سب کی یاد معدوم ہوتی جا رہی ہے، اور اب یہ حالت ہے کہ نہ تو میں محبت کر سکتا ہوں، اور نہ شادی۔ اب صرف ایک جسم سے پیار کر سکتا۔ جہاں میں آج کل رہتا ہوں، وہ جگہ شہر سے الگ تھلگ ہے اس کے باوجود اس جگہ میں اتنی کشش ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی، شاید اس جگہ میں اتنی کشش اور جاذبیت نہ ہوتی اگر سامنے والی کوٹھی میں ایک لڑکی نہ رہتی ہوتی جس کا میں ذکر کرنے والا ہوں۔ ہمارے یہ پڑوسی نہایت امیر و کبیر ہیں ایک عالی شان کوٹھی میں رہتے ہیں۔ باہر ہمیشہ کاریں کھڑی رہتی ہیں لیکن مجھے ان کاروں اور عالیشان کوٹھیوں سے دلچسپی نہیں بلکہ ایک لڑکی سے ہے۔ جو اس کوٹھی میں رہتی ہے۔ میں نے آج تک ایسی حسین و جمیل لڑکی کہیں نہیں دیکھی۔ یہ لڑکی نہیں بلکہ ایک کامل عورت ہے۔ عورت اور لڑکی میں فرق ہوتا ہے بس وہی فرق۔ جب تک تمہاری شادی نہ ہوئی تھی، تم لڑکی تھیں۔ جب تم نے شادی کر لی۔ تم عورت بن گئیں۔ لیکن ہماری پڑوسن شادی کے بغیر ایک مکمل عورت ہے۔ یہ ایک بیسویں صدی کا معمہ ہے۔ جسے تم حل نہ کر سکو گی۔ تمہاری آنے والی نسلیں اس معمہ کا جواب ہوں گی۔

ایک دن وہ مجھے بس میں مل گئی۔ جس حقارت سے اس نے میری طرف دیکھا وہ آج تک میرے سینے میں بچھو کے ڈنک کی طرح رینگ رہی ہے۔ اس نے یوں ہی سرسری نظر سے میرے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ جیسے میری روح کپڑوں میں مقید ہے اور میرا جسم ایک بے جان شے ہے۔ وہ میری سرخ نکٹائی دیکھ کر مسکرائی جس کی گرہ زیادہ استعمال کی وجہ سے میلی ہو گئی تھی۔ پھر اس کی نظر میرے ہیٹ کی طرف گئی۔ جس کا اوپر والا حصہ کافی دبا ہوا تھا۔ میں نے پتلون کی کریز کو درست کیا لیکن میرے بوٹ جن پر دو ماہ سے پالش نہ ہوا تھا۔ میری سراسیمگی پر خشمگیں ہو گئے۔ اس دن میں نے جرابیں بھی نہ پہنی تھیں۔ اصل میں جرابیں پہنتا ہی نہیں۔ اس دن مجھے اپنے جمالیاتی مذاق پر بہت غصہ آیا۔ پتلون کے نچلے حصے اور بوٹوں کے درمیان میری ٹانگوں کا حصہ برہنہ تھا جس پر سخت سخت بال اگے ہوئے تھے۔ بوٹوں کے تسمے میری آوارگی پر ایک قہقہہ لگا رہے تھے۔ شرم سے میں عرق عرق ہو گیا اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔ میں نے اپنے بھونڈے پن کو چھپانے کی بہت کوشش کی لیکن مجھ میں اور اس لڑکی میں کافی تفاوت تھا۔ ایک وسیع خلیج حائل تھی۔ اس کو پاٹنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اس خلیج میں کاریں، کوٹھیاں، ڈینر، نوکرانیاں، چاندی کے سکے، بنک کے نوٹ۔ خوبصورت عورتیں۔ حریری پردے، وہائٹ ہارس۔ چھری کانٹے سب کچھ تیر رہے تھے اور میں دوسرے کنارے پر کھڑا تھا۔ اس کی اس

تمسخر آمیز مسکراہٹ کا مطلب سمجھ گیا لیکن اس کی آنکھیں جن پہ وہ ہمیشہ ایک آسمانی رنگ کی عینک چڑھائے رکھتی ہے۔ وہ اصلیت کو چھپا نہ سکیں۔ وہ آنکھیں مغموم تھیں۔ ان آنکھوں نے دنیا کے خلا کو دیکھ لیا تھا۔ اتنی دولت ہوتے ہوئے اور حسن کی فراوانی کے باوجود یہ آنکھیں بے چین تھیں۔ یہ آنکھیں اداس تھیں ان میں زندگی کی بے ثباتی نمایاں تھی۔ جیسے وہ کسی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئی لیکن اندھی نہ ہو سکی۔ چاندی کے سکے بہت کچھ کر سکتے ہیں ان سکوں سے خوشی کے لمحے خریدے جا سکتے ہیں۔ شاید اس نے بھی کسی کو چاہا؟ اور اس کی محبت پروان نہ چڑھ سکی۔ لڑکی نے منہ پھیر لیا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھی لڑکی سے گفتگو کرنے لگی۔ لڑکی کی آنکھیں افسردہ ہوتی گئیں۔ اس کے دل کی گہرائیوں کا عکس اس کی آنکھوں میں تیر رہا تھا اور آنکھیں صاف کہہ رہی تھیں۔ کیوں جوانی کی امنگوں کو کچلا جائے۔ یہ جوانی کب تک رہے گی۔ یہ دنیا ہر چیز کو بھول جاتی ہے۔ انسان اپنے آپ کو بھول جاتا ہے۔ کیوں نہ اپنے آپ کو ان رنگین پردوں میں چھپایا جائے۔ یہ سنہری تار یہ تھرکتے ہوئے بازو یہ ناچ گھر۔ آنکھوں میں ہر کا ہلکا ہلکا نشہ ٹانگوں کا تھرکنا اور کسی کے بازو کمر میں حمائل۔ اور ناچنا اور ناچ کر چور ہو جانا۔ کیوں نہ اس زندگی کو اپنایا جائے لیکن یہ نشہ ہر وقت قائم نہیں رہتا اور ٹوٹ جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ افسردگی لے لیتی ہے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں۔ مجھے کیا۔ یہ عورت میرے دائرے سے باہر ہے میرے حلقے سے باہر ہے۔ میں کبھی اس کے جسم کو چھو نہیں سکتا۔ میں کسی کو پانے کی ناکام کوشش کرتا ہوں جس کو حاصل کر سکتا تھا۔ جس کے ہونٹوں کو چوم سکتا تھا۔ اس کو دوسرے کے حوالے کر دیا اور آج ایک ایسی عورت کو پانے کی تمنا رکھتا ہوں جس کے ہونٹ دوسرے انسانوں کے لئے وقف ہو چکے ہیں لیکن انسان ہمیشہ اس چیز کو پانے کی کوشش کرتا ہے جو اسے ملتی نہیں۔ میں اپنی بے وقوفی پر ہنستا ہوں۔ اور سوچتا ہوں کہ میں کیوں اکیلا ہوں میں کیوں سایوں کے پیچھے بھاگتا رہتا ہوں۔ میں کیوں نہ کسی کے جسم کو ہمیشہ کے لئے خرید لوں تاکہ اس نہ ختم ہونے والی افسردگی اور تنہائی سے رہائی پا سکوں۔ کیا میں ایسا کر سکوں گا۔ اور اگر کر بھی لیا تو نہیں کیا۔

مہندر ناتھ

نوٹ: اس کہانی کے سب کردار فرضی ہیں۔ اگر کوئی صاحب اس کہانی میں اپنا عکس دیکھیں تو اس کا مصنف ذمہ دار نہیں۔

غزل

جب اس کے لب ہوں میرے دہان و زباں سے دور
میرے لئے وہ ہوتی ہے کون و مکاں سے دور

تیر دعا جو لوٹ کر آتا نہیں کبھی
کچھ آسماں ہیں اور بھی اس آسماں سے دور

پر میرے پھڑ پھڑائے ذرا اور رہ گئے
دیکھا جو در قفس کا کھلا آشیاں سے دور

ارزاں ہے جن کا نقد محبت وہ بد نصیب
بیٹھے ہوئے ہیں حسن گراں کی دکاں سے دور

پرتو ہے اس کا فطرت آزاد پر گراں
چل کر اٹھو رہیں کہیں اس آسماں سے دور

راز بقا ہے جن کے لئے تیرا آستاں
وہ خستہ جاں پڑے ہیں ترے آستاں سے دور

جس کے طفیل سحر ہے اس کے کلام میں
وہ ساحرہ ہے شاہد جادو بیاں سے دور

مسعود شاہد

انقلاب

گھٹا کو دیکھ کے یوں میرا دل دکھا تھا کبھی
جو میرا حال ہوا ہے، بتا ہُوا تھا کبھی

وہ اشک اب مری آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
جنہیں چراغِ سرِ طور جانتا تھا کبھی

وہ نغمے آج ہیں بارش کے سرمگیں جھالے
کہ میں نے تیری زباں سے جنہیں سُنا تھا کبھی

وہ راتیں دن کی طرح رنگ و بو سے عاری ہیں
کہ جن میں تجھ سے مرا سامنا ہوا تھا کبھی

وہ جھرّیاں مرے چہرے پہ ہیں بھنور کی طرح
جنہیں تلاطمِ دریا میں پا چکا تھا کبھی

وہ کیا تھا سحر تری مست مست آنکھوں کا
کبھی تجھے تو دو عالم کو دیکھتا تھا کبھی

وہ آرزوئیں جنہیں خون دے کے پالا تھا
اُنہیں سے پوچھ تجھے کتنا چاہتا تھا کبھی

یہ انتہا ہے کہ تجھ کو بھی اب نہیں جائز
وہ ایک سجدہ خدا کو بھی جو روا تھا کبھی

اُڑا دیا ہے ترے غم کی دھوپ نے جس کو
وہ رنگ بھی مرے گالوں پہ کھیلتا تھا کبھی

وہی چراغ نگاہوں میں مسکراتا ہے
جو تیری بزمِ مسرت میں جل رہا تھا کبھی

وہ باتیں میری زباں سے ادا نہیں ہوتیں
کُریدکر جنہیں اوروں سے پوچھتا تھا کبھی

کچھ اس طرح کی بلاخیز ہے یہ طغیانی
کہ ناخدا بھی نہیں جو مرا خدا تھا کبھی

یہ زندگی ہے نفس و نفس کا روگ نہیں
مری حیات ظفر میرے بس کا روگ نہیں

یوسف ظفر

آرٹ اور حُسن

آرٹ کیا ہے!

کیٹس کا مشہور مصرعہ ہے "حُسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن" بعض نقاد حسن کو تو حقیقت تسلیم کرتے ہیں مگر اُن کے خیال میں ہر حقیقت حسین نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس مصرعے میں بہت کچھ غور و خوض کا سامان موجود ہے۔

"حقیقت" "خیر" اور "حسن" تین ایسے پُرمعنی الفاظ ہیں جن کی ابھی تک کوئی جامع اور مانع تعریف نہیں ہو سکی مگر انہی ریت کی بنیادوں پر انسانی علم و ادراک کے تین مسلمہ شعبوں مذہب، سائنس اور آرٹ کی سربفلک عمارتیں استوار کی گئیں۔ جب مذہب قدیم بت پرستی کے دور سے نکل کر یہود اور بنی اسرائیل کے پیمبروں نے وحدانیت کا اچھوتا تصور پیش کیا تو انسانی اعمال کی نیکی یا بدی کا معیار خدا کی خوشنودی قرار دیا گیا۔ اور خیر کے نئے تصور کا آغاز ہوا۔ سائنس کی ترقی اور ترویج کے لئے ضروری تھا کہ اس کے اصول واقعات اور حقائق کی گود میں پرورش پاتے۔ مگر حُسن کا احساس بغیر کسی قسم کی تبلیغ اور تجسس کے ذہن انسانی پر مرتسم ہوتا گیا ہے۔ ہاں یہ بات شروع سے ہی فلاسفہ کے حیطہ میں کھٹکتی رہی کہ سائنس کی حقیقت اور آرٹ کی حقیقت میں نمایاں فرق ہے۔ سائنس کے نزدیک جو اشیا ہم اپنی ظاہری آنکھوں سے دیکھ سکتے یا دوسرے حواس سے محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً دمکتا ہوا چاند، بہتی ہوئی ندی، کڑکتی ہوئی رعد اور سرسبز درخت سب حقیقی وجود رکھتے ہیں مگر آرٹ اور مذہب کے نزدیک یہ اصلی حقیقت کے سائے ہیں۔ ان کی اصلی حقیقت صرف تخئیل یا وجدان کی نگاہوں سے ہی دیکھی جا سکتی ہے۔ اصغر گونڈوی سے

کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے ۔ مجھ سے دیکھا نہ گیا حُسن کا رُسوا ہونا

ہم اس فریبی مگر حقیقی دنیا میں بستے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم میں سے بیشتر لوگ حسن کے وجدانی قویٰ ماؤف ہو چکے ہیں۔ اس دنیا کی مخلوق کو دیکھ نہیں سکتے جو نگاہ تیرہ دل وجود کو چیر کر کسی چیز کی اصلیت کا مشاہدہ کر سکتی ہے وہ یا تو پیغمبر کی نگاہ ہوگی یا فن کار کی۔ ایک فن کار جب احساس حسن کی تپش اور شدت سے بے تاب اور از خود رفتہ ہو جاتا ہے تو اس کی آنکھوں کے سامنے ان پوشیدہ ہیولوں کے اصلی نقوش جھلملانے لگتے ہیں۔ آرٹ انہی نقوش کو پتھر، صفحۂ کاغذ، ترنم یا الفاظ میں منتقل کرنے کا نام ہے۔

ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے علم النفس کی بنیاد رکھی اور پھر اس میں جمالیات کے باب کا اضافہ کیا۔ علم جمالیات کی تدوین کے ساتھ آرٹ کے نقد و تبصرہ کے لئے اس نے چند اصول بھی مرتب کئے۔ وہ کہتا ہے کہ فنی تخلیقات کا وجود ہمارے جذبۂ بیان کا محتاج ہے۔ ہم کسی عجیب و غریب فعل کو دیکھ کر بے اختیار اُس کی نقل اتارنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی نقل اتارنے سے ہم لطف و تفریح محسوس کرتے ہیں۔ آرٹ کا مقصد بھی چربہ اتارنا ہے۔ مگر اشیاء کی ظاہری شکل و صورت کا نہیں بلکہ اُس لطیف کیفیت کا جو اُن کی ماہیت میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر ہم روکھی پھیکی نقل اتارنے پر ہی قادر ہو سکے تو ایک بندر ہم سے بازی لے جائے گا۔ کیونکہ اس کی نقل میں تمسخر کا سامان تو موجود ہوگا۔ اس فرق کو سمجھنے کے لئے کسی حسین عورت کے عریاں فوٹو اور اجنتا کی کسی تصویر کا مقابلہ کریں۔ اجنتا کی تصویروں میں چند زاویوں، قوسوں اور دائروں میں نسوانی حسن کے منتہا کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ فوٹو میں آپ کو یہ کیفیت دکھائی نہیں دے گی۔ فوٹوگرافی کی بے چارگی ہی اُسے فن کار کے سامنے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دے گی۔

فرانسس بیکن نے بھی جس نے ارسطو کے منطقیانہ اصولوں سے ہٹ کر نئے طرز استدلال کی بنیاد رکھی۔ جمالیات کی صنف میں اُس کے بیشتر خیالات سے اتفاق کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنے مخصوص دقیق پیرائے میں کہتا ہے کہ آرٹ ہے انسان کا فطرت میں جمع ہو

جانا" اس معمے کو واضح کرنے کے لئے ایک مصور کی مثال لیجے۔ فطرت اس کو خام مواد مثلاً نیلا آسمان، شگفتہ پھول، چنار کے درخت متلاطم سمندر وغیرہ مہیا کرتی ہے اور وہ ان مناظر اور اشیا کو اس نزاکتِ فن سے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے کہ دیکھنے والے کے منہ سے بے اختیار "واہ" نکلتی ہے۔ اسی طرح فطرت ایک شاعر کو حسرت و آرزو، ناز و نیاز، امید و بیم احساسات فنا و بقا کے واردات بہم پہنچاتی ہے اور وہ ایک دلگداز نظم کہہ دیتا ہے۔ ایک وہبی فن کار فطرت کے گوناگوں مناظر اور انسانی جذبات کی پیچیدہ کشمکش سے اُن کی بنیادی خصوصیات چن لیتا ہے کیونکہ اُس کی نگاہِ دقیقہ رس سہ

در دل سنگ بنگر رقص بتانِ آذری۔

گوئٹے ایک جگہ لکھتا ہے نطرت کے ساتھ فن کار کا تعلق دوگونہ ہوتا ہے۔ وہ بیک وقت فطرت کا غلام اور اُس کا آقا ہوتا ہے۔ غلام اس لئے کہ وہ فطری ذرائع کا محتاج ہے اور آقا اس لئے کہ اُن ذرائع کو اپنے بلند تخیّل کی تشکیل میں بروئے کار لاتا ہے"۔

ارسطو کے مندرجہ بالا فنی نظریہ پر تمام متاخرین نے صاد کیا ہے۔ شوپنہار نے جب یہ کہا کہ ایک فنی شاہ کار سے محظوظ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنی انفرادیت کو قطعاً بھول جائیں تو اس وقت وہ آرٹ کی ماہیت سے زیادہ اس کے تاثر سے بحث کر رہا تھا۔ ہاں سنہ ۱۹۰۲ء میں اطالوی حکیم بینی ڈیٹو کروس نے فن اور حسن کے موضوع پر نئے زاویۂ نگاہ سے قلم اٹھایا اور بڑی کاوش کے بعد حسن کا ایک نیا تصور پیش کرنے کی کوشش کی۔ اس کے طرزِ استدلال میں جدتِ فکر اور شگفتگیٔ بیان نمایاں خصوصیات ہیں۔ ارسطو کے بعد کسی حکیم نے اس مسئلہ پر کروس جیسی دقتِ نگاہ کا ثبوت نہیں دیا۔ کروس علم کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے، عقلی اور وجدانی۔ اشیا کی ماہیت کا علم اور ان کے باہمی تعلقات کا انکشاف پہلی صنف سے سائنس کے عقدے حل کئے جاتے ہیں اور دوسری صنف سے خیالی تصاویر کا ظہور ہوتا ہے۔ آرٹ کا ارتقا اسی قوتِ متخیلہ کا مرہونِ منت ہے۔ یہاں تک تو اُس نے جدید پیرائے میں ارسطو کے خیال کو دہرایا ہے۔ ہاں آگے جا کر وہ اپنی ڈگر الگ بنانا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں اس نے دعوےٰ کیا ہے کہ آرٹ سراسر تخیّل کا محتاج ہے۔ خیالی تصاویر ہی اس کا اولین اور آخری سرمایہ ہیں۔ آرٹ ان تصاویر میں حقیقی اور غیر حقیقی کا امتیاز نہیں کرتا، نہ اُن کی تعریف کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلکہ وہ صرف انہیں محسوس کرتا ہے اور من و عن ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ کروس کے نزدیک تخیّل فکر و استدلال کا پیشرو ہے اور آرٹ کا جزوِ لاینفک۔ وہ شخص جس کا ذہن خیالی تصاویر کی تخلیق کر سکتا ہے فن کار کہلانے کا مستحق ہے، اس سے پہلے کہ وہ انہیں کاغذ پر یا رقم میں محفوظ کرنے کی کوشش کرے۔ مشہور اطالوی مصور مائیکل اینجلو کا مقولہ ہے۔ "نقاش اپنے ہاتھوں سے نہیں بلکہ دماغ سے تصویر کھینچتا ہے" آرٹ کا اعجاز ہے کہ فن کار جس چیز کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے اس کا مکمل نقش اپنے ذہن میں محفوظ کر لیتا ہے۔ یہ خیالی نقش اس چیز کی تمام بنیادی صفات کا حامل ہوتا ہے۔ کروس اس خیالی نقش کو ظاہری جامہ پہنانے کی کوشش کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کوشش کا تعلق محض تکنیک سے ہو گا۔ جب ہم نے اندرونی کیفیات کو پا لیا عالمِ خیال میں ایک مجسمہ یا نقش کا مشاہدہ کر لیا یا موسیقی کی کسی لرزش کو سن لیا تو ان کا اظہار مکمل ہو چکا۔ اس کے بعد اگر ہم اس نقش کو کھینچنے کے لئے موقلم اٹھائیں یا بجانے کے لئے ساز چھیڑیں تو ہم کیا کریں گے محض وہی جو پہلے کر چکے ہیں۔ ان افعال کا تعلق تکنیک سے ہو گا انہیں جمالیات میں دھر گھسیٹنا غلطی ہے۔

کروس کا یہ نظریہ ایک مدت تک یورپ اور امریکہ میں علما کے غور و فکر کا موضوع بنا رہا۔ بعض اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کو محض اس وجہ سے شاعر مان لیا جائے کہ وہ فطری مناظر یا نسوانی حسن کا خیالی پیکرِ جمیل اپنے ذہن میں دیکھ سکتا ہے۔ مگر اس کو موزوں الفاظ میں ہمارے سامنے پیش نہیں کر سکتا سہ

شور لیست نوا ریزی تارِ نفسم را
پیدا نہ اے جنبشِ مضراب کجائی

کیا آرٹ صرفِ تخیّل کا ہی مرہونِ منت ہے یا اظہار تکنیک سے بے نیاز ہے؟ جب کوئی نقاش اپنی تصویر پیش کرے تو ہم کیسے یقین کر لیں کہ یہ تصویر اس کے اصلی خیالی پیکر کا صحیح چربہ ہے اور ذہن

سے کاغذ پر منتقل ہوتے وقت اس میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس جگہ ہمیں تکنیک کی اہمیت کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ ہم کیوں کر یہ منظر جانوروں کا صحیح نقش دیکھ کر بے اختیار واہ واہ کرنے لگتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ ہمیں تکنیک کے کمال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

ان اعتراضات کی معقولیت ظاہر ہے مگر اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ کروچے نے تخئیل کی اہمیت واضح کرکے انتہائی جودت طبع کا ثبوت دیا۔ ایک شخص جس کو نعمت تخئیل اور جدت فکر کی نعمتیں ودیعت کی گئی ہیں اور وہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہی اپنے خیالات کا اظہار کر دیتا ہے۔ اس متشاعر سے بہتر ہے جن کی مسلسل مسجع اور مقفیٰ نظموں میں کہیں بھی زندگی کی دھڑکن محسوس نہیں ہوتی۔

ایک صاحب ذوق انسان کے دل میں لطیف احساسات کا ہجوم کسی نہ کسی شکل میں راہ نکال ہی لیتا ہے اس چشمہ کی طرح جس کا ابلتا ہوا مضطرب پانی سنگلاخ چٹان کو چیر کر بہہ نکلتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تکنیک فنی اعتبار سے آرٹ کا لازمی جزو ہے مگر بعض فنکار اسی کو تخئیل کو آرٹ کا مقصد اولیٰ سمجھ بیٹھتے ہیں بسا اوقات خطوط اور زاویوں کی نمائش اور رنگوں کی آمیزش کا شوق آرٹ کے جھوٹے مدعی پیدا کر دیتا ہے۔ کروچے نے تخئیل پر زور دے کر از سر نو آرٹ کی الہامی عظمت کو زندہ کر دیا۔

یہاں ہمیں دیکھنا ہے کہ کیا کروچے کا یہ نظریہ ہمیں حسن کے مسئلہ کو حل کرنے میں مدد دے گا۔ حسن کیا ہے؟

اس سوال کے اتنے ہی جواب ہیں جتنے مفکرین۔ حقیقت اور خیر کی طرح ہم حسن کو مرئی شکل میں نہیں دیکھ سکتے۔ نہ آسانی محسوس کر سکتے ہیں۔ جس طرح کسی نیک آدمی کے شائستہ اطوار اور مہذب اخلاق کو دیکھ کر ہم نیکی کا تصور کر سکتے ہیں اسی طرح کسی حسین چہرے یا دلکش فطری منظر کو دیکھ کر حسن کا بھی تصور کر سکتے ہیں۔

سپینوزا کا قول ہے "حسن لذت کے حصول کا دوسرا نام ہے"
ٹریلاکرائے کہتا ہے "حسن کا واحد مقصد دل کو مسرت بخشنا ہے۔"

سینڈھل کا مقولہ ہے "حسن لذت کا وعدہ ہے"۔
پروسٹ کا خیال ہے کہ جب ہم کسی سے محبت کرتے ہیں تو در اصل ہم اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں۔ محبوب کا حسن ہمیں محض اس لئے عزیز ہے کہ وہ ہمارے مثالی تصور جمال کے موافق ہے۔ حسن صرف دیکھنے والے کی نگاہ میں ہوتا ہے۔ اسی خیال کو اصغر نے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے ؎

وہ عشق کی عظمت سے شاید نہیں واقف ہیں
سو حسن کروں پیدا ایک ایک تمنا سے

مشہور سنگتراش روڈن ایک جگہ لکھتا ہے "فطرت میں بدصورتی کا نام و نشان تک نہیں ملتا۔ مجھے یقین ہے کہ ساری کائنات حسین ہے اور ہر ایک انسان خوبصورت۔ بدصورت سے بدصورت عورت بھی اپنے چاہنے والے کے بازوؤں میں حسن کا مجسمہ بن جاتی ہے۔ شاعر کسی خاص فطری منظر یا کسی خاص حسین عورت کے چہرے میں حسن کا مطالعہ کرتا ہے اور میں فطرت کے ہر منظر اور ہر عورت کو حسین سمجھتا ہوں۔ جوانی میں میں کسی نسوانی مجسمہ کا سینہ نہیں تراش سکتا تھا۔ جب تک کہ میں کسی حسین عورت کے چہرے کا تصور نہ کر لیتا مگر آج مجھے کسی حبشی عورت کو سامنے بٹھا کر بھی سینہ تراشنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ حسن کے اس تصور نے مجھے اس قابل کر دیا ہے کہ میں روحانی حسن کا بھی اندازہ لگا سکوں" آخری فقرہ کے پیش نظر اس جگہ یہ کہنا موزوں ہوگا کہ عاشق فنکار اور صوفی ایک ہی سرچشمہ فیض سے مستفید ہوتے ہیں۔ عاشق ہر خوبصورت چیز میں اپنی محبوبہ کے خد و خال کا مطالعہ کرتا ہے۔ فنکار اپنے احساسات جمال کی روشنی میں ہر جگہ حسن کی تلاش کرتا ہے اور صوفی فطرت کے ہر منظر میں حسن کل کو دیکھ پاتا ہے ؎

جہاں مرقع تصویر حسن اوست تمام
بحیرتم کہ ببندم دل از کہ بر دارم

اناطول فرانس جس کی فنی عظمت عالم آشکارا ہے کہتا ہے "ہم کبھی معلوم نہیں کر سکیں گے کہ حسن کیا ہے۔ میں تو صرف اپنے احساسات کی پیروی کرتا ہوں۔ کسی چیز کی ماہیت نہ جانتے ہوئے بھی میں محسوس کر لیتا ہوں کہ فلاں اس چیز کا حسین پہلو ہے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ تم حقیقت کے طالب ہو یا حسن کے تو میں کہوں گا "حسن کا جس کے سوا دنیا میں کوئی چیز حقیقی نہیں"۔

اسی سوال کے جواب میں گوئٹے نے کہا تھا " میں حقیقت کا جویا ہوں کیوں کہ صرف حقیقت ہی حسین ہوتی ہے ۔ یہاں ہمیں پھر کیٹس کا مصرعہ یاد آجاتا ہے ۔ "حسن حقیقت ہے اور حقیقت حسن" کروس کا خیال ہے کہ حسن نام ہے اس خیالی نقش کی تخلیق کا جو ایک شخص اپنے ذہن میں دیکھ پاتا ہے اور جو اپنے محرک کا بہترین چربہ ہوتی ہے ۔ یہی نقش حسن کی جان ہے ۔ بیرونی شکل و صورت تو صرف ثانوی حیثیت رکھتی ہے ۔ کروس کہتا ہے کہ صرف جلیل القدر فن کار ہی حسن کو اپنے اصلی رنگ میں دیکھ سکتے ہیں اور اس سے اثر پذیر ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں ۔ یہاں وہ پھر غلط کی رو میں بہہ گیا ہے ۔ امر واقع یہ ہے کہ حسن ہر متنفس جاہل و عالم ۔ عاقل و بے وقوف ۔ بالغ اور کمسن کے لئے مسرت اور اہتزاز کا باعث ہوتا ہے ۔

اختلاف رائے کے باوجود تمام کلمات حسن کی ایک صورت پر متفق ہیں اور وہ ہے لذت کا عنصر حسن ہمیشہ اور ہر دیکھنے والے کو فرحت بخشتا ہے ۔ یہ ممکن ہے کہ ایک مہذب انسان کے دل میں بدصورتی کو دیکھ کر نفرت اور حقارت کا جذبہ پیدا نہ ہو ۔ مگر یہ قطعی طور پر صحیح ہو کہ ایک حسین منظر یا حسین تصویر یا حسین عورت کو دیکھ کر ہمارے سراپا میں مسرت کی گہری لہر دوڑ جاتی ہے ۔ جابر سے جابر انسان بھی تابش جمال کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے ۔ بڑے بڑے تارک الدنیا عابد بھی حسن کے آستانے پر سر جھکانے پر مجبور ہو گئے ؎

شاہداں از آتش رخسار رنگیں و مبدم
زاہداں را رخنہ ہا اندر دل و دیں کردہ اند

سید علی عباس



123695
13.3.95

جیوتشی

بیٹھا ہے سرِ رہ بیٹھا ہوا اپنا کمال
راکھ ہے بسی ہوئی، بالوں کے سر گچھے ہیں
گورے ماتھے پہ ہیں رنگین لکیروں کے نشاں
جیسے جاپان کے ریشم کا چمکتا ٹکڑا
لکڑی کے منکوں کی گردن میں ہیں کچھ مالائیں
بھیس بدلے ہوئے پُر رعب رشی مُنیوں کا
کھوتا ہے سرِ راہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
حال مستقبل و ماضی کے نہفتہ اسرار
چار زمانے کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کے لئے

عرصۂ دہر کے آلام سے گھبرائی ہوئی
بھوکی، ناکام، ملول اور پریشاں مخلوق
زرد رخساروں، تھکے چہروں بجھی آنکھوں میں
غمِ اُلفت، غمِ اولاد، غمِ محرومی
ایسی کتنی ہی علامات کے انبار لئے
چھپتی، ڈرتی چلی آتی ہے ہتھیلی پھیلائے
محض اپنے دلِ بے صبر کی تسکیں کے لئے
ورنہ ہاتھوں کی لکیروں میں خزانے تو نہیں

بیٹھا ہے سرِ راہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
خواب بیدار مست جوانی کی حسیں راتوں کے
بیچتا ہے سرِ رہ دولت و اولاد کے ڈھیر
چار زمانے کے چمکتے ہوئے ٹکڑوں کے لئے
کتنا جاں بخش ہے رنگین فریبِ تقدیر
اس کی روزی کا جو سامان بنا جاتا ہے
کتنا جاں بخش ہے رنگین فریب تقدیر
دل ہوئے جاتے ہیں لبریز امیدِ موہوم

بیچتا ہے سرِ رہ بیٹھا ہوا شان کے ساتھ
بیم و اُمید کے کچھ ایسے جفا پیشہ خیال
جنہیں اپنا کے فنا جوہرِ ہستی ہو جائے
زندگی جن سے مقدر کا سہارا ڈھونڈے
زندگی میں نہ رہے جن سے تگ و تازِ عمل
اور مسدود گذرگاہِ ترقی ہو جائے
بیچتا ہے سرِ رہ شہد سے میٹھی باتیں
یعنی تقدیر کے زہراب کے کچھ ایسے جام
کام جن پر کوئی تریاق نہیں کر سکتا

مخمور جالندھری

مسکراہٹ

"کیا سوچ رہے ہو، بڑی حسین مسکراہٹ ہے چہرے پر!"

"ہاں، خیال بھی نہایت حسین ہے، بہت خوش آئند!"

"آخر؟"

"سوچتا ہوں کہ اگر یہ اسی بخار میں چل دیں، اور جوانا مرگ بیٹی کے غم میں اماں بھی، تو گھر میں گنجائش کی قلت رفع ہو جائے گی!"

"لاحول ولا قوۃ! کیسی واہیات باتیں کرتے ہو" — "اماشو ہمولی طیریا میں آپ یہ وسوسے لئے بیٹھے ہیں۔"

"اس میں وسوسے کی کیا بات ہے، ہاں یہ خیال ضرور ہے کہ تکلیف بہت معمولی ہے اور خدشہ کم!"

"کچھ دل بہلانے والی باتیں کرو یار میں تو تنگ آگیا تیمارداری کرتے کرتے۔ تم اپنی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھے سگرٹ پیا کرتے ہو کسی بات کی فکر ہی نہیں!"

"فکر تو میں بہت دور کی کرتا ہوں، آپ لوگ سامنے کی مشکلات ہی سے تنگ آجاتے ہیں، آگے کی فکر کیا کیجئے گا!"

"چھوڑو بھی یار اس تذکرے کو، کچھ اچھی اچھی باتیں کرو۔"

"جناب وسکی بھر کے تو پیسے اس وقت ہیں نہیں، چلئے کہیں سے دو دو گلاس تاڑی کے چڑھائیں اور پھر چلیں کسی رنڈی کے یہاں منی سے تو میری راہ ورسم بھی ہے حساب رہتا ہے حضرت، حساب! ابھی میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر عاشق ہو گئی ہے۔ ورنہ رنڈیاں ادھار کی قائل نہیں ہوتیں۔ اور رنڈی بھی چوتی والی۔ کیا کرے بے چاری کو گانا وانا نہیں آتا ورنہ چیز اونچی تھی لیکن سیکھ رہی ہے، آواز اچھی ہے، ابھی کمسن بھی تو ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ، کوئی تک کی بھی کہو گے!"

"ابھی آپ دل بہلاؤ کی فرمائش کر رہے تھے، اب تک کی باتیں چاہتے ہیں۔ کچھ عجیب سے ہیں آپ بھی، رنڈی اور شراب سے زیادہ دل بہلاؤ کی بات مجھے تو کوئی آتی نہیں سوائے اگر آپ سیاست پر گفتگو کرنا پسند کریں تو بات دوسری ہے۔ میں ایک صورت ان دونوں مباحث کو خلط ملط کرنے کی تجویز کر سکتا ہوں یعنی یہ کہ پیجئے تاڑی پیجئے اور پھر نشے میں اسٹالین کی شان میں قصیدہ پڑھئے اور ہٹلر کو مغلظات سنائیے۔"

"کیسی کہی!"

"تمہارے سر پر تو جنون سوار ہے"

"اب آپ منہ بنا کر باتیں کرنے پہ تلے ہوئے ہیں تو جانے دیجئے"

(۲)

"تم زندگی کو سمجھ نہ سکے۔"

"جی"

"تم مسکرا رہے ہو!"

"اور کیا کروں؟"

"تمہارا مطلب ہے تم زندگی کو سمجھتے ہو!"

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"تم نے میری بات کا جواب نہ دیا۔"

"اس میں جواب کی گنجائش ہی کیا ہے، آپ نے میرے بارے میں ایک رائے ظاہر کی ہے، آپ کو اپنی رائے رکھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا کسی اور کو۔"

"زندگی صرف منطق کا نام نہیں ہے۔"

"مگر منطق سے خالی بھی نہیں۔"

"یہ رائے ہے تمہاری زندگی کے متعلق۔"

"آپ میرے متعلق اپنی رائے سے گریز کر رہے ہیں!"

"کیونکر"

"میں زندگی کو سمجھے بغیر اس کے متعلق کوئی رائے کیسے قائم کر سکتا ہوں!"

"غلط فہمیاں نا سمجھی میں بھی قائم کی جا سکتی ہیں"۔

"تو آپ کے خیال میں زندگی کو منطق سے کوئی واسطہ نہیں
پھر ہماری گفتگو لایعنی ہے۔ اور زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی"۔

"تم میری بات ٹال رہے ہو"۔

"کونسی بات؟"

"یہی کہ تم زندگی کو سمجھ نہ سکے"۔

"سمجھتا تو شاید ہوں لیکن سوچتا ہوں کہ صرف سمجھنا کافی نہیں ہے"۔

"یہی تمہاری ناسمجھی ہے"۔

"زندگی صرف منطق کا نام نہیں ہے"۔

. . . . . .

. . . . . .

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟"

"میرا خیال ہے آدمی یا تو زندگی کو محسوس کرنے سے پہلے
سمجھ لے اور یا پھر کبھی نہ سمجھے"۔

"تم سمجھ اور احساس کو اس قدر متفاوت کیوں سمجھتے ہو، میرے
خیال میں وہ تو تجربات کے مختلف مدارج ہیں اور بس"۔

"سمجھتا تو نہیں ہوں لیکن محسوس کرتا ہوں، تجربہ ذرا دیر
سے بنتا ہے اور منفی ہوں"۔

"تم پھر مسکرا دیئے!"

"ہاں"۔

(۳)

"بہت مصروف ہو رہے ہو آج کل"۔

"زندگی مصروفیت کا نام ہے"۔

"پہلے تو تم ایسا نہ سمجھتے تھے"۔

"سمجھتا تو تھا"۔

"کبھی ظاہر نہ کیا"۔

"ہر بات بیک وقت تو ظاہر نہیں کی جا سکتی"۔

"تو اس میں تمہیں سکون ملتا ہے؟"

"سکون! مصروفیت میں بھی سکون! سکون کو لے کر کیا
کروں گا؟"

"میرا مطلب ہے خوشی جو اس زندگی میں!"

"زندگی کے لئے خوشی کچھ ایسی ضروری نہیں"۔

"اور تمہیں غم کیا ہے!"

"میں مغموم تو نہیں رہتا اس کی فرصت کسے ہے!"

"اگر فرصت ہوتی"

"مفروضات کا میں قائل نہیں"

"لیکن اس سے پہلے جب تم اتنے مصروف نہیں تھے۔
یہ تو مفروضہ نہیں — تب کیا تم مغموم رہتے تھے؟"

"یہ آپ جانتے کیا میں اس وقت مغموم رہا کرتا تھا؟"

"ہر بات بیک وقت ظاہر تو نہیں کی جا سکتی"۔

"اور اب اس کے اظہار کا وقت گذر چکا"۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو"۔

"اور آپ اسے کرید رہے ہیں"۔

". . . . ."

". . . . ."

"تم نے اپنے دل کی بات نہ بتائی"۔

"دل کی بات؟"

"ہاں تمہارا راز جو تمہاری مسکراہٹ میں جھلکا کرتا تھا"۔

"آپ اتنا سب کچھ جان کر بھی کہتے ہیں میں نے آپ کو
بتایا نہیں! بتانے کے طریقے ہوتے ہیں"۔

"لیکن تمہاری وہ مسکراہٹ ہوئی کیا؟"

"مسکراتا تو میں اب بھی ہوں، یہ دیکھئے"۔

"یوں نہیں۔ پہلے تم اور طرح مسکراتے تھے"۔

"ہاں اب ابتسام کی مشق کرنے کا وقت کم ملتا ہے نا!"

"مشق! یہ تم مشق کیا کرتے تھے"۔

"اور آپ کیا سمجھے تھے؟"

"تو ممکن ہے اب تم دوسری طرح مسکرانا سیکھ رہے ہو"۔

"ممکن ہے سیکھ رہا ہوں ممکن ہے سیکھ چکا ہوں"۔

"لیکن تم اتنی غیر مخلص زندگی کو برداشت کیسے کر سکتے ہو"۔

"غیر مخلص! غیر مخلص کیوں؟ میں نہایت خلوص سے مشق کرتا ہوں"

"کچھ عجیب سے ہو تم بھی"

"بالکل نہیں، آپ سب بھی یہی کہتے ہیں۔ اور اگر نہیں کرتے تو گویا آپ کو اپنے اوپر قدرت نہیں ہے۔ آپ کی تمام حرکات غیر ارادی اور بے اختیارانہ ہوتی ہیں جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا، کوئی معنی نہیں ہوتے۔ اگر آپ کو اپنے اوپر اختیار ہے اور آپ کے سامنے کوئی مقصد ہے تو آپ کی ہر حرکت اس مقصد کے حصول کی کاوش ہو گی۔ اس کاوش و اختیار کا نام میں مشق رکھتا ہوں۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟"

"ہوں"

"جی"

"......"

"........."

(۴)

"تمہیں یقین نہیں آتا نا؟"

"تم مجھے یقین دلانا چاہتی ہو؟ کیا یقین دلانا چاہتی ہو؟"

"تم اب تک یہ بھی نہیں سمجھ سکے؟"

"نہ"

"تو پھر جانے دو۔"

"اچھا۔"

"...........؟"

"...........!"

"تم بڑے سنگ دل ہو۔"

"کیوں؟ تمہاری محبت کا یقین نہیں کرتا اس لئے؟"

"ہاں۔"

"لیکن محبت ٹھکرائی بھی تو جا سکتی ہے، جان بوجھ کر بھی تو ٹھکرائی جاتی ہے۔"

"بلا سے تم یقین کر لو، پھر ٹھکرا دینا!"

"پہلے ادھر دیکھو۔"

"آپ سمجھتے ہیں کہ میں عورت ہوں میں یہ زہرخند برداشت نہیں کر سکوں گی؟"

"نہیں میں جانتا ہوں کہ تم ان عورتوں میں سے ہو جن کی زندگی ایک اس سے بھی زیادہ تلخ زہرخند ہوتی ہے۔ اور وہ اس میں خوش رہتی ہیں۔"

"تم مجھے جتانا چاہتے ہو کہ میں رنڈی ہوں اور رنڈی کبھی کسی سے محبت نہیں کر سکتی؟"

"رنڈی محبت تو بہتوں سے کر سکتی ہے لیکن۔ تم نے چھری اور خربوزہ والی مثل تو سنی ہو گی۔"

"اب آپ مذاق پر اتر آئے۔"

"یہی تو مشکل ہے تم اب تک سنجیدہ بنی ہوئی ہو۔"

"لیکن آپ یقین کیوں نہیں کرتے کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔"

"تمہیں خود اپنی بات کا یقین ہے؟"

"آپ بڑے سنگدل ہیں۔"

"ٹھیک ہے مگر یہ تو سوچو میں تمہاری محبت کا یقین کر کے کروں گا بھی کیا؟ بغیر اس یقین کے تمہارے ہاں آتا ہوں۔ تمہیں روپے دیتا ہوں رات رات بھر پڑا تم سے باتیں کرتا رہتا ہوں تم اس سے زیادہ اور کیا چاہتی ہو۔؟"

"آپ ان احسانات سے بھی ہاتھ کھینچ لیجئے۔ یہاں آنا جانا بھی ترک کر دیجئے، لیکن یقین کر لیجئے۔"

"اوہو، اتنا اعتماد ہے آپ کو اپنی محبت پر! خود فریبی کی بھی انتہا ہوتی ہے!"

"خود فریبی!"

"ہاں، اگر تم مجھے دھوکا نہیں دے رہی ہو تو شاید خود فریبی میں مبتلا ہو۔"

"تو تمہیں یقین آ گیا — یہی کہ میں تمہیں دھوکا نہیں دے رہی ہوں۔"

"میں تمہیں ایک ہوشیار لڑکی سمجھتا تھا۔ کا ہے کا رنڈی کی لیکن تم بالکل بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔"

"بچوں کی سی باتیں کر رہی ہوں؟"

"ہاں، بالکل بچوں کی سی۔ دیکھو نا، تمہاری جوانی عریانی

اور بے باکی کے ماحول میں بیدار ہوئی تمہارے شباب کی سب سے پہلی انگڑائی کا استقبال ایک کھلی ہوئی آغوش نے کیا تمہیں کبھی محرومی و مایوسی کا تجربہ ہی نہیں ہوا تم نے اپنی نسائیت کو زندگی کا مرکز سمجھا ہی نہیں۔ پھر تم محبت کیسے کرسکتی ہو! تمہاری محبت کے معنی کیا ہیں؟"

"میں نہیں جانتی تھی کہ آپ مجھے اتنا پست سمجھتے ہیں اور محبت کو اتنا بلند!"

"اس میں بلندی اور پستی کا کوئی سوال نہیں۔ صرف زندگی کے تجربات کا سوال ہے، تم نے جس انداز سے زندگی گزاری ہے اور گزار رہی ہو، تم نے زندگی کا جس رُخ سے تجربہ کیا ہے اس میں مجھے محبت کی گنجائش نظر نہیں آتی۔"

"آپ محبت کسے کہتے ہیں؟"

"دبی ہوئی، کچلی ہوئی جوانی کا وہ مبالغہ آمیز احساس جو زندگی کی تمام باتوں کو الٹ پلٹ کردیتا ہے۔"

"کیا آسودہ جوانیاں محبت نہیں کرتیں؟"

"کرتی ہیں، لیکن وہاں سوال صرف ترجیح کا ہوتا ہے۔ لیکن تمہارے لئے کوئی خاص لذت نہیں ہے۔ نہ تمہیں اس پر کامل اختیار رہی ہے۔ تم مجھے اپنے پیشے پر ترجیح نہیں دے سکتیں۔ اور تمہارے پیشے کا تعلق ہر اس شخص سے ہے جو تمہارے ہاں آئے اور تمہاری قیمت دینے پر تیار ہو، اس وقت تم اس کی اور میری صورت کا مقابلہ کرنے نہیں بیٹھ سکتیں۔"

"اگر میں آپ کو اپنے پیشے پر ترجیح دوں؟"

"تو میں اسے پرلے سرے کی حماقت سمجھوں گا ـــــ اور میں خود اسے برداشت بھی نہیں کروں گا۔ مجھے اگر محبت کی تلاش ہوتی تو میں تمہارے ہاں تم لوگوں کے ہاں نہ آتا۔"

"..............."

"..............."

"میرا خیال ہے ہم دوستی تو کرہی سکتے ہیں۔"

"میرے برتاؤ میں اس سے کچھ تبدیلی نہ ہوگی۔ میں باتیں عموماً جس سے بھی کرتا ہوں کھل کر کرتا ہوں۔ اور سودا کرتے وقت اپنے اوپر اور دوسرے پر اعتماد کرنے کا عادی ہوں۔"

"آپ مسکرایا نہ کیجئے، یوں نہ مسکرایا کیجئے۔"

"تمہیں تو دعوے تھا کہ تم اسے برداشت کرسکتی ہو۔"

"میرے سب دعوے باطل ہوگئے۔"

(۵)

"آؤ بیٹھو، اس وقت کیسے آئے؟"

"جیسے سب آتے ہیں، جیسے میں ہر وقت آتا ہوں۔"

"اوہ۔"

"میں آج جارہا ہوں۔"

"جارہے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟"

"دنیا بہت وسیع ہے۔"

"آخر"

"میں تم سے کسی خاص جگہ کی اجازت لینے نہیں آیا تھا۔"

"تو پھر"

"خیال آیا کہ کسی کو بھول جانے سے پہلے اسے ایک نظر دیکھ لینا چاہیئے۔"

"اچھا، تو گویا میں قربانی کا ایک بکرا ہوں۔ جسے آپ آخری دفعہ دانہ کھلانے آئے ہیں۔"

"قربانی؟ قربانی کیسی؟ کس کی قربانی؟ لیکن تم مسکرا رہی ہو!"

"ہاں۔ سوچتی ہوں کہ تم بھی کیسے نادان ہو۔"

"کیوں؟"

"اتنے دن سے رنڈیوں کے ہاں آتے جاتے ہو مگر آج تک یہ نہ سمجھ سکے کہ ان کے ہاں ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔"

"ان کے ہاں کیا ایسی باتیں کی تو کہیں بھی نہیں جاتیں لیکن شاید تم مجھے یاد دلانا چاہتی ہو کہ میری جان پہچان اس شہر میں صرف تمہیں سے نہیں۔"

"ہوں اس شہر میں کوٹھے ہیں تو بہت۔"

"اور کوٹھوں پر ہی کیا منحصر ہے، لیکن میں ان سب سے رخصت ہونے نہیں جاؤں گا۔ بہت وقت لگے گا۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

"میری گاڑی چھ بج کر دس منٹ پر چھوٹتی ہے۔"

"اوہ، تب تو واقعی وقت کم ہے۔ لیکن یہ مخصوص عنایت میرے ہی اوپر کیوں؟"

"بات یہ ہے کہ ان سب کو بھول جانا کچھ ایسا ضروری نہیں۔"

"وہی پرانی مسکراہٹ!"

"وہی پرانی مسکراہٹ۔"

"ایسی پرانی بھی تو نہیں۔"

"ہاں، لیکن اب پرانی ہو جائے گی، بالکل پرانی، بہت پرانی"

"........!"

"اچھا جاتا ہوں۔"

"جاؤ گے — کہاں جاؤ گے؟ کیا کرو گے جا کر؟"

"دنیا بہت وسیع ہے، اور بہت مصروف۔"

"ہاں اور کیا، اور تم مجھ سے اجازت لینے آئے بھی تو نہیں تھے"

"ٹھیک ہے"

"بالکل ٹھیک۔"

"تو میں چلا۔"

"ساغر —"

"رہنے دو اول بدل میں چھلک جائے گا لیکن تم مسکراؤ مت۔"

"ادھر دیکھو، میں مسکرا نہیں رہی ہوں!"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔"

"سنو تو، ذرا ٹھہرو۔"

"میں جا رہا ہوں!"

"اچھا۔"

....

....

"تم لوٹ آئے! تم کیوں لوٹ آئے؟"

"کوئی ضرورت تو نہیں ہے؟"

"ضرورت پوری کرنے والے بہت ہیں اور مل جائیں گے"

"ٹھیک ہے اچھا تو میں جاؤں، —"

تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ایک بات بتا سکتے ہو؟"

"کہو"

"یہ آخر کالے پانی کی سزا تم نے میرے ہی لئے کیوں تجویز کی؟"

"کالا پانی! ابھی تم قربانی کر رہی تھیں، یہ سب کیا ہے؟"

"تم مجھے بھول جاؤ گے نا!"

"تمہیں بھول تو جانا ہی پڑے گا۔ دنیا اتنی وسیع، اتنی بھرپور اتنی مصروف جو ہے۔"

"اور انہیں، ان سب کو؟"

"تم آخر ان کے پیچھے کیوں پڑی ہو؟ میرا حافظہ کمزور تو نہیں زندگی کے واقعات، زندگی کی دلچسپیاں یاد رہتی ہی ہیں۔"

"تو میں زندگی میں ایک واقعہ۔ ایک دلچسپی کا درجہ بھی نہیں رکھتی؟"

"کبھی!"

"...... اوہ، معاف کرنا شاید میں یہ مسکرا دی۔"

"خیر اب سنبھل کر بیٹھو، میں جاتا ہوں۔ اور لوگ آتے ہوں گے"

"ہاں زندگی کی ضروریات تو پوری ہوں گی۔"

"ضرور پوری ہوں گی، زندگی کی سب ضروریات پوری ہوں گی خواہشات بھی پوری ہوں گی، زندگی کی سب خواہشات پوری ہوں گی اور ارادے بھی، میرے ارادے کبھی بغیر پورے ہوئے نہیں رہتے۔"

(۶)

"میں اتنا بے اختیار کبھی نہیں ہوا!"

"تم اپنی کمزوری دکھا کر مجھے پگھلانا چاہتے ہو۔"

"میں اپنی قوت سے تمہیں زیر نہیں کرنا چاہتا!"

"نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے؟"

"میں اس کا جواب نہیں دوں گا۔ میں نے جیت اور کامرانی کے جشن بہت منائے ہیں لیکن اب میں تھک گیا ہوں۔"

"یہ شکست کی آواز ہے"

"میں شکست کھانا چاہتا ہوں، سب کچھ ہار جانا چاہتا ہوں"

"تم غلطی کر رہے ہو، کمزوری عورت کا حربہ ہے لیکن تمہارے

لئے وہ صرف کمزوری ہے۔ صرف کمزوری جو تمہیں حقیر بنا سکتی ہے پناہ نہیں دے سکتی۔"

"تمہاری گود میں مجھے پناہ مل سکتی ہے۔"

"میری گود کامیاب لوگوں کے لئے ہے۔ کمزوروں کی پناہ گاہ نہیں اسے جیتا جا سکتا ہے۔ مانگا نہیں جا سکتا۔ وہ نشانِ منزل ہے۔ جہاں تک خال خال ہی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ سنگِ میل نہیں جس پر سر تھکا ہارا مسافر سر رکھ کر سو جاتا ہے۔"

"تم سچ کہتی ہو۔ میں تھکا ہوا ہوں۔ بالکل تھک چکا ہوں میں اب سنگِ میل کو نشانِ منزل بنانا چاہتا ہوں۔"

"سنگِ میل!"

"ہاں!"

"تو تم لوٹ جاؤ۔ راستے میں بہت سے ایسے پتھر چھوڑ آئے ہو۔"

"کیوں؟ کیا آگے کوئی اور نشان نہیں صرف منزل ہے لیکن یہ تم کیا جانو۔ تمہاری نظریں تو صرف ایک طرف لگی ہوئی ہیں۔ جدھر سے تھکے ماندے مسافر تم سے پناہ مانگنے آتے ہیں اور کبھی مایوس اور کبھی کامران لوٹ جاتے ہیں۔"

"تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"تم نے غلطی کی عورت کا حربہ کمزوری ہے۔ صرف کمزوری"

"کمزوروں سے غلطیاں بھی ہوتی ہیں۔ مجھے معاف کر دو۔"

"اب دیر ہو چکی میں جا رہا ہوں۔"

"ٹھہرو۔ ذرا ٹھہرو۔"

"میں جا رہا ہوں۔"

"تم مت جاؤ۔ اب تمہیں کہیں نہیں جانا ہے تم کہاں جاؤ گے؟ کیسے جاؤ گے۔"

"کیا کرو گے جا کر؟"

"میرا دامن چھوڑ دو۔"

"میں ایسے نہیں چھوڑ سکتی۔ میں تمہیں نہیں جانے دوں گی۔"

"تم مجھے نہیں روک سکتی ہو۔ اب دیر ہو چکی ہے۔"

"لیکن ......"

"تم جانتی ہو تم کہاں کھڑی ہو؟"

"اپنے دروازے پر۔"

"ہاں، اپنے دروازے کے باہر۔"

"تم اسی دروازے سے آئے تھے نا!"

"ہاں، لیکن اس مرتبہ اس دروازے سے لوٹ کر تم جا رہی ہو۔ جدھر سے تم آئی تھیں۔ جدھر سے سب آتے اور لوٹ جاتے ہیں۔"

"اور تم؟ کیا تم یہاں رہو گے؟"

"میں ــــ؟ تم جاؤ۔"

"لیکن تم یہاں کیسے رہو گے۔ کیا کرو گے یہاں رہ کر! اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔"

"تم جاؤ۔"

"میں تمہیں یوں تنہا چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔"

"تنہا ــــ؟ تم جاؤ۔ .... میں یہاں نہیں رہوں گا ــــ تمہاری پناہ گاہ میں ــــ نہیں..... تم جاؤ.... جاؤ۔"

نصیر حیدر

اورینٹل

ریت کے بورے اور اینٹوں کی دیواریں شاید آپ کی حفاظت کر سکیں۔ اگر نہیں تو ہم آپ کے متعلقین کی یقیناً حفاظت کریں گے بشرطیکہ آپ ہمارے پاس بیمہ شدہ ہوں۔ سول افراد کے لئے اقساط مقررہ میں بغیر کسی اضافہ کے جنگی خطرات کی ذمہ داری لی جاتی ہے۔

سابقہ ادا شدہ بیمہ جات کی رقم ۶،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے سے زیادہ

بیمہ جات رواں کی مالیت ۸۵،۵۲،۰۰،۰۰۰ روپے سے زیادہ

۱۹۴۱ء کے لئے سالانہ آمدنی تقریباً ۲،۵۰،۰۰،۰۰ روپے

سرمایہ تقریباً .... ۱۸،۰۰،۰۰،۰۰۰ روپے

دیوان ہالداس سونی ایف سی آئی ایڈنبرگ ایف آر ای ایس (لندن) **برانچ سکرٹری**

اورینٹل گورنمنٹ سکیورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ ۷ سی ڈی ایل لاہور

ہیڈ آفس بمبئی ہندوستان میں قائم شدہ ۱۸۷۴ء

بہار کے دو گیت

پہلا

پھر دن آئے
آئے بہار کے پھر دن آئے
اُٹک مٹک کر چلیں ممولے
چھُپی چھُپی کہیں شاما بولے
کلی کلی بھونرا منڈلائے
—— اور گائے
آئے بہار کے پھر دن آئے

ہر ہریالی
پیت نے اپنے روپ میں ڈھالی
بنی کھڑی ہے صبح سہانی
کرشن کنہیا، رادھا رانی
ہری بھری سنجوگ کی ڈالی
—— لہرائے
آئے بہار کے پھر دن آئے

آخری

میں نہ گاؤں گی
پڑ رہی ہے کیوں پھوار ناچتی ہے کیوں بہار
میں نہ گاؤں گی سکھی
یہ ترانے یہ نکھار
ہو رہے ہیں دل کے پار
جان ہی سے جاؤں گی
میں نہ گاؤں گی سکھی اب نہ گاؤں گی

میں نہ گاؤں گی
ہو چکی ہیں مہرباں مجھ پہ غم کی سختیاں
بھول جاؤں گی سکھی
یہ زمیں یہ آسماں
جا رہی ہوں میں جہاں
اُن کو اپنا پاؤں گی
میں نہ گاؤں گی سکھی اب نہ گاؤنگی

قیوم نظر

دنیائے ادب

ایک اور ایک چار

خدانخواستہ مجھے ذاتی تجربہ تو نہیں لیکن یہ دیکھا اور سنا ضرور ہے کہ بیوی زچگی میں تکلیف بہت ہوتی ہے اور خاص کر ایسی صورت میں کہ یہ آفت اس وقت نازل ہو جب عورت عمر سے اتر چکی ہو لیکن کیوں ہوتا ہے اس کو تو وہی بیبیاں بیان کرسکیں گی جن پر یہ مصیبت پڑ چکی ہے۔ ہاں اپنے گھر کا صرف ایک واقعہ دیکھ کر یقین آگیا ہے کہ واقعی یہ مثل صحیح ہے کہ جننا اور مرنا دونوں برابر ہیں۔ وہ واقعہ کیا تھا اس کو بھی سن لیجئے:-

ہماری بیگم صاحبہ جب سے گھر والی بن کر آئیں ہم اور وہ مل کر بس ایک اور ایک، دو ہی رہے۔ سنتے تھے کہ گنڈے تعویذوں سے ایک اور ایک تین ہو جاتے ہیں لیکن کوئی گنڈا تعویذ حساب کے اس ہیر پھیر کو نہ توڑ سکا، کہ ایک اور ایک برابر ہیں دو کے۔ آخر ہار مان لی اور سمجھ گئے کہ ہم دونوں بھی ایک، ایک ہی چل دیں گے اور اس طرح ایک، دو تین ہو جائیں گے۔

یہ سب کچھ تھا مگر دنیا باتیں قائم کی دُم برابر لگی ہوئی تھی۔ کوئی ڈاکٹر نہیں تھا جس نے فیسوں سے جیب نہ بھری ہو، کوئی حکیم صاحب نہیں تھے جنہوں نے قدحوں کی بھرمار سے ہماری بیوی کا معدہ خراب نہ کیا ہو، کوئی وید جی نہیں تھے جن کی دسانتیں سر چڑھ کر دکان تک رفتہ رفتہ نہ ہوئی ہوں۔ مگر ہماری بیگم صاحبہ کے جسم کا درمیانی حصہ جیسے کا تیسا ہی رہا۔ انسان کی یہی وہ حالت ہے جس کو دنیاوی زبان میں لاچاری اور مذہبی زبان میں تسلیم کہتے ہیں۔ آخر تنگ آکر حکیموں، ڈاکٹروں، ویدوں، ملاؤں، داڑھی والوں، مونچھوں والوں، صفاچٹوں، زلفوں والوں اور خرمنڈوں سب کو چھوڑ بیٹھے۔ اور کہاں نہ چھوڑ بیٹھتے جب پیچھا کرنا تو کجا ان میں سے کوئی یہ بھی نہ بتا سکا کہ آخر اس مشکل حمل کے متعلق

ہم دونوں میں سے کس کا قصور ہے۔ بہرحال ہماری بیوی کا ماجب کسی کام سے انسان لاچار ہو جاتا ہے تو ہمیشہ لعنت برائے آتا ہے۔ ہم بھی انسان تھے اس لئے ہم نے بھی یہی کہا کہ بچوں پر لعنت بھیجو، جس طرح گھر کی حکومت رعایا کے بغیر صرف بادشاہ اور وزیر پر چل رہی ہے۔ اسی طرح چلنے دو۔ ہیں اس وقت اس بحث میں جانا بے ضرور سمجھتا ہوں کہ ہمارے گھر میں وزیر کون تھا اور بادشاہ کون۔ ہاں یہ اصول بتا دینا چاہتا ہوں کہ جس گھر میں بے تشریف لے آتے ہیں۔ وہاں حکومت کی باگ بیوی کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ کیونکہ میاں ڈرتے ہیں کہ اگر بیوی نے بغاوت پکڑ باندھ لی تو یہ ساری رعایا ان کے ساتھ ہو جائے گی اور پھر اس سلطنت بے آئین میں ٹکڑا کھانے کو نہ ملے گا۔ البتہ جہاں معاملہ برعکس ہوتا ہے۔ وہاں رنگ ہی کچھ دوسرا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ بیوی ڈرتی ہیں کہ اگر اس جیتے مانس نے کوئی دوسرا وزیر مقرر کر لیا تو جینا مشکل ہو جائے گا اور وزراء کا اختلاف سارے سلطنت میں آفت برپا کر دے گا۔ لیکن یقین مانئے کہ ہمارے گھر میں اس اصول کے برسرکار آنے کی وجہ باقی نہیں رہی تھی اور وجہ اس لئے باقی نہیں رہی تھی کہ اس کمترین کا وہ زمانہ بیوی کی وداد میں گزر چکا تھا جب سلطنت کو دو وزیروں کے ذریعہ چلانے کا خیال پیدا ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ اس لئے ہم نے ارادہ کر لیا کہ اب بہت گئی تھوڑی رہی ہے۔ اس کو بھی کسی طرح بڑی بی کے ساتھ رد کرتے ہم ختم کر ڈالیں۔

الغرض کئی برس یوں ہی نکل گئے ایک دن ہیں دفتر سے آکر بیٹھا ہی تھا کہ ہماری بیگم صاحبہ کچھ شرمائی ہوئی آئیں اور میرے پاس بیٹھ گئیں اب کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ مگر جھینپتی جاتی ہیں آخر بڑی ہمت کر کے ذرا نیچی آواز میں کہا۔ اجی ایک بات کہوں۔ میں نے کہا تمہیں کہنے سے

...س نے روکا ہے، ایک نہیں سو بار کہو، مگر آج آپ کچھ جھینپی جھینپی سی کیوں ہیں؟" کہنے لگیں: "میں امید سے ہوں"

یقین مانئے میں بالکل نہیں سمجھا کہ اس موقع پر "امید سے ہونے" کے کیا معنی ہیں؟ اور ہو سکتے ہیں۔ سچ ہے کہ کسی زمانہ میں پڑھا ضرور تھا کہ "امید سے ہونا" "حاملہ ہونے" کے معنی رکھتا ہے۔ لیکن اول تو یہ فقرہ ہماری بیوی صاحبہ نے کہا تھا جن کا امید سے ہونا ایک خلاف امید واقعہ تھا، دوسرے امید میرے سالے کا نام بھی تھا خیال ہوا کہ شاید یہ گفتگو ان ہی حضرت سے متعلق ہے، تیسرے یہ کہ اگر یہ واقعہ خود ان سے متعلق تھا تو اس عمر کی عورت کو ایسی معمولی بات لینے میں شرمانے کی کیا وجہ ہو سکتی تھی۔ بہرحال میں نے ان سے کہا کہ ذرا وضاحت فرما دی جائے تو مناسب ہے پھر کچھ شرما کر کہنے لگیں:۔

"کیوں ننھا بچہ بنتے ہو، تم کو یہ بھی معلوم نہیں کہ امید سے ہوں!"

اس وقت میں ذرا سمجھا، مگر اس واقعہ کو کسی طرح بھی اپنی بیگم صاحبہ سے متعلق نہ کر سکا اس لئے میں نے کہا:۔

"پیٹ سے ہے تو ہو لے دو، ہماری اور تمہاری جوتی سے جیسا کیا ہے ویسا بھگتے گی"۔ اس پر انہوں نے اس زور سے "توبہ" کی کہ میں اچھل پڑا! اور کہا آخر ان پہیلیوں کے بوجھوانے سے فائدہ! صاف کیوں نہیں کہتیں، کیا امید کی بیوی پیٹ سے ہے یا کہ ہمسائی کی بیٹی۔؟

انہوں نے ذرا شرما کر کہا "میں"

یقین مانئے اگر کوئی بم کا گولہ ٹھیک میری چندیا پر گرتا تو اتنا جھٹکا نہ پہنچتا جتنا اس "میں" سے پہنچا، میں بیٹھا لکھ رہا تھا قلم خود بخود ہاتھ سے گر پڑا اور میں نے ٹھوڑی کو مٹھی میں بڑے زور سے دبا کر کہا "کیا ارشاد ہوا، کیا آپ امید سے ہیں؟ بس جانے بھی دو، اتنا جھوٹ بولنے سے فائدہ؟"

کہنے لگیں "نہیں میں سچ کہتی ہوں"۔

میں نے کہا "میں نہیں مانتا تمہارے کبھی پہلے کوئی بال بچہ ہوا ہے؟ جو تمہیں معلوم ہو کہ پیٹ سے ہونا کس کو کہتے ہیں؟"

کہنے لگیں "واہ! یہ بھی خوب ہوئی، خاندان میں سینکڑوں بچے میرے سامنے ہو چکے ہیں مجھے اتنا بھی معلوم نہیں کہ آثار کیا ہوتے ہیں؟"

میں نے کہا "اب جو تمہاری عمر ہے اس میں وہی شکل ہو جاتی ہے جو امید سے ہونے میں ہوتی ہے، جاؤ جاؤ اپنا کام کرو خواہ مخواہ کیوں جھوٹوں میں اپنی ہنسی اڑاتی ہو قسم خدا کی اگر تمہارا یہ وہم نہیں گیا تو خاندان بھر میں نکو ہو جاؤ گی، اور ہر شخص تمہیں دیکھ کر منہ پیٹ پر ہاتھ پھیرا کرے گا"

کہنے لگیں "آخر تم مجھے جھوٹا کیوں سمجھتے ہو؟ اللہ کی دین ہے جو [illegible] نے جس دائی کو آج بلایا تھا اس کا بھی یہی خیال ہے کہ ....." یہ کہہ کر انہوں نے گردن جھکا لی اور پھر مسکرا کر میرے پاس سے اٹھ گئیں۔

اب جناب آپ ہی غور فرمایئے کہ اس خبر وحشت اثر کا مجھ پر کیا اثر نہ ہوا ہوگا۔ فرض کر لیجئے کہ پالیس پینتالیس برس کی بیوی پیٹ سے ہیں اور اس ہماری [illegible] ہے، ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سن میں یہ اس جھٹکے کو سہہ بھی سکیں گی یا نہیں اور فرض کیجئے کہ سہہ بھی گئیں تو سوال یہ ہے کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی اور فرض کیجئے کہ وہ ہوا بھی یا ہوئی بھی تو سوال یہ ہے کہ اس بڑھاپے کی اولاد میں اتنی سکت بھی ہوگی کہ وہ جی سکے اور فرض کیجئے کہ وہ جیا بھی یا جی بھی تو سوال یہ ہے کہ ہم اس وقت تک رہ بھی سکیں گے جب تک وہ لڑکا پڑھ لکھ کر کمانے کے قابل ہو جائے یا وہ صاحبزادی صاحبہ جوان ہو کر ہم [illegible] خویش ساس بن سکیں۔

قصہ مختصر یہ کہ بیگم صاحبہ کی اس "میں" نے لفظ "کن" کی طرح خیالات کی ایک نئی دنیا قائم کر دی۔ مایوسی نے ہم دونوں کا اتنا دل توڑ دیا تھا کہ اس "چھپر پھاڑ" دولت پر یقین ہی نہیں آتا تھا لیکن جب کئی ایسی دائیوں اور ڈاکٹرنیوں نے تصدیق کر دی جن کو میری بیوی سے مخالفت کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی تھی اس وقت بات کچھ پکی ہوئی اور مجھے اور میری بیوی کو یقین ہو گیا کہ ہم دونوں عنقریب کسی مرد یا عورت کے ماں باپ بننے والے ہیں۔

اس واردات کے اطمینان کے بعد ہم میں اور ہماری بیوی میں دنوں تک کچھ کھچا کھچی بھی رہی۔ وجہ اختلاف وہی پیٹ کے اندر والی چیز تھی میں کہتا تھا کہ بیٹا ہو تو اچھا، بیوی کہتی تھیں کہ بیٹی ہو تو اچھا

یہ حجت تھی کہ بیٹا ہوگا تو جائداد کا وارث ہوگا، ہم نے اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کیا ہے وہ ٹھکانے لگے گا"

بیوی فرماتی تھیں کہ بیٹی ہوگی تو ہوا کی طرح بڑھے گی، آج اتنی ہے کل اتنی ہوگی پرسوں اتنی ہو جائے گی، کم سے کم مرنے سے پہلے ہم اس کا سہرا تو دیکھ لیں گے۔ غرض کوئی دن نہ جاتا ہوگا جو اس مضمون پر کچھ کشمکش نہ ہو جاتی ہو۔

زمانہ جس تیزی سے گزرتا ہے وہ سب ہی کو معلوم ہے ایک مہینہ گیا، دو مہینے گئے، تین مہینے گئے اور متلی کے ساتھ ہی اور ع لوع کا وظیفہ دن رات پڑھا جانے لگا یہ بھی آخر کہاں تک، ہوتے ہوتے ساتواں مہینہ لگ گیا۔ ہماری بیوی کو اگر رنج تھا تو یہی تھا کہ اب خاندان کے بڑے بوڑھوں میں کوئی ایسا نہ رہا جو اس عمر میں ان کی گود بھرتا، کوئی ایسا نہ رہا جو تشریف لانے والے بزرگوار کے کپڑے سینا، ناپے اور ٹکیاں تیار کرتا، کوئی چھوٹا موٹا زیور بنواتا۔ غرض جدھر نظر ڈالتے میدان صاف پاتے۔ آخر خود ہونے والی زچہ ہی نے یہ دوسروں کا کام اپنے ذمے لیا اور چھپا چھپ کپڑے سلنے اور زیور بننے لگے۔

خیر کپڑوں کی حد تک تو مجھے بھی کچھ اعتراض نہ تھا کیوں کہ لڑکی ہو یا لڑکا، دونوں کے کپڑے ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ مگر زیوروں کے معاملے میں میری رائے بیگم صاحبہ سے ذرا مختلف تھی، فرض کیجئے کہ ان کے ہاں لڑکا ہوا تو ایسی صورت میں یہ زیور کہاں جائیں گے اور حالت یہ ہے کہ زیور بناؤ تو سو روپے میں بنے اور نکالو تو پچیس روپے میں جائے

ہماری بیگم صاحبہ ایک حجت قائم کرتی تھیں مگر مجھے اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتی تھیں کہ اچھا سمجھ لو کہ اب کے لڑکا ہوا زیور رکھے رہیں گے۔ اس کے بعد انشاءاللہ لڑکی ہوگی یہ اس کے کام آئیں گے"۔

میں تو کیا آپ ہی ذرا انصاف کیجئے کہ اس حجت میں کوئی قوت ہے جس عورت کے ہاں پورے چھتیس برس تک لڑکا لڑکی ہونا تو در کنار ریح ہے کا بچہ نہ ہوا ہو اس کا صرف ایک دفعہ امید سے ہو جانے کے بعد یہ سمجھ لینا کہ دنیا کی آبادی میں اضافہ کرنے کا تمغہ آئندہ اسی کو ملنے والا ہے کس حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر بھی بات یہ ہے کہ اولاد ہونے یا کم سے کم اولاد ہونے کی توقع ہو جانے کی وہ خوشی ہوتی ہے کہ ایسی چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور بڑھاپے میں پہلا باپ بننا یا بننے کا متوقع ہونا انسان کے دماغ کے توازن کو بگاڑ دیتا ہے

اب کیا تھا بیوی بیچ میں سے دن بدن کچھ بڑھتی ہی گئیں۔ اتنی بڑھیں کہ ایک دن میں نے جل کر کہا کہ بیوی میں بھی تو سنوں آخر تمہارا ارادہ کیا ہے، کیا کوئی بابا پورا بچہ جننا چاہتی ہو۔ یہ سن کر وہ تو بگڑ ہی گئیں اور کہنے لگیں "تمہیں ایسی فال زبان سے نکالتے وہم نہیں آتا، جو لوجہ ہے مجھ ہی پہ تو ہے تم کیوں بلبلائے جاتے ہو۔"

ہوتے ہوتے ان کا گھیر گھیر ایسا بڑھا کہ چلنا پھرنا مشکل ہو گیا پاؤں پر ورم آ گیا، سانس لینے میں دقت ہونے لگی اور خدا کی عنایت سے نواں مہینہ لگ ہی گیا۔ اب کیا تھا ذرا کچھ پیٹ میں گڑبڑ ہوئی یا بچہ نے پھیرا لیا اور بیگم صاحبہ پلنگ پر دراز ہو گئیں، ۔ تھوڑی دیر میں یہ درد کم ہوا اور بات کل پر جا پڑی اور ہم بھی مایوس ہو کر دفتر چلے گئے۔

آخر یہ دھوکا بازی کب تک چلتی ایک دن وہ آ ہی گیا کہ ان کو سچ مچ درد شروع ہوئے۔ دردوں کا شروع ہونا تھا کہ انہوں نے غل مچا کر سارے محلے میں منادی کر دی کہ اب اس گھر لی بیوی بچہ کی ماں بننے پر پوری طرح تیار اور آمادہ ہیں۔ لیکن بڑھاپے کی لاج رکھنے کے لئے انہوں نے کسی کو نہیں بلایا۔ جانتی تھیں کہ اگر ایک کو بھی اطلاع دی تو یہ بن کوڑی بن پیسہ کا تماشہ دیکھنے سارا کنبہ الٹ آئے گا۔ ہاں یہ کیا کہ پہلے تو ایک کھوسٹ دائی کو بلوا لیا لیکن آدھ گھنٹہ کے بعد ہی اس کو ناکافی سمجھا گیا، ڈاکٹرنی بلائی گئی۔ اس نے اپنی مدد کے لئے اپنی دوسری بہن کو بلا لیا، ان دونوں نے مل کر یہ صلاح کی کہ کسی بڑے ڈاکٹر کا بلا لینا بھی اچھا ہے، ان کے لگے بندھے ایک ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے۔ اس کے بعد ان تینوں کی رائے ہوئی کہ ڈاکٹر بھوڑگاؤں کا بھی آ جانا مناسب ہے۔ کیوں کہ پہلی زچگی ہے اور زچہ کی عمر زیادہ ہے یہ بھی آ گئے اور اپنے ساتھ لیڈی ڈاکٹر سیفٹی کو بھی لائے۔ الغرض اتنے ڈاکٹر اور ڈاکٹرنیاں آئیں کہ

تو ہرگز نہیں سمجھے کہ دونوں کی دعائیں ایک ساتھ قبول کی جائیں اور ایک کے بجائے دو بچے عنایت ہوں مگر کیا کیا جائے جب دونوں دعائیں قبول ہو چکی تھیں تو ان کا اثر ظاہر ہوئے بغیر تھوڑی رہ سکتا تھا۔ غرض پھر رونے کا وہی شور و غل اندر اُٹھنے اور وظیفہ پڑھنے کا زور باہر ہونے لگا۔

خدا خدا کر کے یہ دوسری مشکل بھی آسان ہوئی اور ہم سمجھے کہ چلو گنگا نہا لئے، اس کو کچھ دیر نہ گزری تھی کہ بدھائیوں کا سلسلہ بیوی صاحبہ نے لگا دیا۔ مجھے ڈر ہوا کہ کہیں تیسرے صاحب تو تشریف نہیں لا رہے ہیں۔ مگر جب یہ معلوم ہوا کہ آنول نکلنے کے لئے چوٹی کے بال منہ میں ڈال کر یہ ابکائیاں دلوائی جا رہی ہیں۔ اُس وقت پریشانی رفع ہوئی

غرض اسی کراہٹ میں صبح ہو گئی۔ ڈاکٹر اپنی اپنی فیس لے کر رخصت ہوئے، ڈاکٹرنیوں نے دونوں بچوں کو نہلا دھلا زچہ کے دونوں پہلوؤں میں لٹا دیا بابا کر مجھے مبارک باد دی فیسیں لیں اور خدا حافظ کہا۔ اب گھر میں ہماری بیوی اور ایک کھوسٹ دائی رہ گئے۔

تھوڑی دیر میں اُس نے آکر کہا، "میاں آپ بچوں کے کان میں اذان دے دیجئے"۔ یہ ذرا ٹیڑھی کھیر تھی اول تو کبھی اذان دی ہی نہیں تھی۔ دوسرے یہ کہ بچے کے کان میں اذان دیتے کسی کو سنا بھی نہیں تھا اور سب سے زیادہ مشکل یہ تھی کہ اذان دی جائے تو آواز کو کس درجہ تک بلند کیا جائے لیکن وقت یہ آن پڑی تھی کہ گھر میں ہمارے سوا کوئی اور مرد بھی نہ تھا، اس لئے ہم ہی بسم اللہ کہہ کر اذان دینے کو تیار ہو گئے۔ اندر گئے بیوی دو شالہ تانے لمبی لمبی پڑی تھیں۔ مجھے دیکھ کر کچھ شرما گئیں، اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے کہا واہ بیوی واہ یا تو اتنی تھڑ تھڑ تھیں کہ ایک بچہ بھی دینا گوارا نہ تھا یا اب دو دو کی لین لگا دی ہے اگر یہی دو اور دو چار اور دو چھ کا سلسلہ چلا تو پھر تمہارا اور میرا اللہ ہی مالک ہے۔ بس اب ایک بات کرو اول تو بچہ کے لئے دعا ہی نہ مانگو اور اگر مانگو تو پہلے مجھ سے کہہ دیا کرو تا کہ ایسا نہ ہو کہ میں بھی دعا مانگوں اور پھر اس کی منظوری میں کچھ غلط فہمی ہو جائے

بیوی منہ سے تو کچھ نہ بولیں ہاں مسکرا کر چپ ہو گئیں۔

نیشنل لیباریٹریز لاہور کی شہرت اب پنجاب سے نکل کر ہندوستان کے ہر شہر کونے کونے میں پھیل گئی ہے

کیونکہ اس کی بنائی ہوئی تمام چیزیں اپنی عمدگی اور قیمت کی کفایت کے لحاظ سے ولایتی اشیا کو مات کرتی ہیں۔

نیشنل لیباریٹریز کے اورینج اور لیمن سکواشِ عرقیات، عطر، سینٹ، بیل کریم اور اینٹی سپٹک سوپ اپنے مقابلے کے ولایتی مصنوعات سے ہزار درجہ بہتر اور قیمت میں بھی بالکفایت ہیں یہی وجہ ہے کہ تمام معقول دکاندار اس کا سٹاک رکھتے ہیں اور اپنے گاہکوں کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں

شاعروں کا مقولہ توڑ دیا گیا

دردِ سر کے واسطے کہتے ہیں صندل ہے مفید
اس کا گھسنا اور لگانا دردِ سر یہ بھی تو ہے

صندل آئل جس کے استعمال سے دائمی دردِ سر دور ہو جاتا ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے بے نظیر تحفہ ہے

مونا سنو پر جلال بادشاہ سے لے کر بے خانماں گدا تک خوبصورتی کا خواہشمند ہے۔ اس کے چند روزہ استعمال سے کیل چھائیاں جھریاں اور ہر قسم کے داغ دور ہو جائیں گے اور چہرہ چاند کی مانند نکل آئے گا۔ ایک دفعہ ضرور استعمال کریں۔

سول ایجنٹ: بیلی رام اینڈ برادرز سوداگران ادویات انارکلی لاہور

آپ نے دیکھا کہ واقعات کے تھوڑے سے ادل بدل میں میری اور اُن کی حالت میں کتنا فرق آ گیا! سچ ہے کہ دل کو اطمینان ہونے کے بعد انسان کو اسی طرح مذاق کی سوجھتی ہے جس طرح پیٹ بھرنے کے بعد شیطانی خیالات نئے نئے رنگ بدل کر دماغ میں چکر لگانے لگتے ہیں۔ خیر کچھ بھی ہو ہم میاں بیوی نے مل کر یہ تو ثابت کر دیا کہ ایک اور ایک مل کر چار ہوتے ہیں نہ کہ دو اور ساتھ ہی میر تقی میر کے اس شعر کا کہ

غم ساتھ ہوا کُل سے اس کی   ایک آئے تھے اور دو گئے ہم

اس طرح جواب ہو گیا

بیوی سے ہوئے ہیں جڑواں بچے   دو تھے چار ہو گئے ہم

آج کی تاریخ سے ہم کو کسی قدر یقین ہو گیا کہ ہمارا سلسلۂ نسب دنیا کی تاریخ میں کچھ عرصہ تک بظاہر چلنے والا ہے۔ لڑکے کا تاریخی نام تو میں نے "مشکل ورود خان" رکھ لیا ہے۔ البتہ لڑکی کا نام ٹھیک نہیں بیٹھتا اس لئے دوستوں اور عزیزوں اور خاص کر شعراء صاحبانِ ملک سے دست بستہ عرض پرداز ہوں کہ کوئی مناسب نام تجویز کر کے ممنون و مشکور فرمائیں لیکن اس کا خیال رہے کہ از سول عقیقہ ہونے والا ہے اور بقول ہماری بیوی صاحبہ کے "عقیقہ ہی میں ڈال ڈالنے کا قاعدہ ہے"۔ اب یہ نام ڈال ناچہ معنی دارد۔ اس کو وہ سمجھتی ہوں تو سمجھتی ہوں میں تو نہیں سمجھتا۔

(ہمدرد صحت دہلی۔ مارچ ۱۹۴۳ء) مرزا فرحت اللہ بیگ

تصحیح

شمارہ جنوری میں جناب عبد المجید بھٹی کے گیت کا آخری مصرعہ "کون آیا اور کون گیا" کی بجائے "کوئی آیا کوئی گیا" چھپ گیا ہے۔ ناظرین درست فرمالیں۔

خوبصورتی کے لئے ایک اشارہ

AFGHAN SNOW



خوبصورتی کا راز

حسین چہرے سے بڑھ کر اور کوئی چیز زیادہ جاذبِ نظر نہیں افغان سنو کا استعمال اسے اور بھی حسین بنا دیتا ہے یہ مشہور عالم خوبصورتی بڑھانے والی سنو جلد کو سورج کی تپش ہوا اور گرد سے محفوظ رکھتی ہے

سول ڈسٹری بیوٹرز:۔ پاٹن والا لمیٹڈ بمبئی نمبر ۳۔

گزارش احوال واقعی

12.3.95
13.3.95

جو حضرات مدت دراز سے کارخانے کی تیار کردہ اشیا استعمال کرتے ہیں اُن سے مخفی نہیں کہ کارخانے نے سنہ ۱۸۳۹ء سے اب تک سو سال سے زائد عرصہ میں ان کے سامنے خالص چیزیں پیش کی۔ زمانے کی رفتار کے مطابق ہمارے کارخانے کی ترقی جن لوگوں سے نہ دیکھی گئی انہوں نے جہاں کارخانے کے خلاف مختلف قسم کے واقعات جن کا کوئی وجود نہیں مشہور کیئے وہاں کارخانے کی اشیا کے متعلق بھی بے بنیاد باتیں ملک میں اس لئے پھیلائیں تاکہ اپنی تیار کردہ اشیا کی فروخت سے فائدہ حاصل کریں جن کے خالص ہونے میں اگرچہ بظاہر وہ خوشبو میں ہمارے مال سے بہتر معلوم ہوتا ہے اور قیمت میں بھی ہمارے عطر و تیل سے سستا ہوتا ہے مگر استعمال کے بعد آپ کو پتہ چل جاتا ہے۔ علاوہ اس کے آپ کا پیسہ ضائع ہوتا ہے بعض وقت اس قسم کی آمیزش باعث مضرت ثابت ہوتی ہے۔

اس لئے اپنے ان عزیزوں سے خصوصاً جو کارخانے کا مال ہمیشہ استعمال کرتے رہے ہیں اور بائی خریداروں سے عموماً عرض ہے کہ کفایت سے خریدنے سے پہلے ملاحظہ کر لیجئے کہ وہ چیز خالص بھی ہے کہ محض خوشبو جو انگریزی عطروں کے ملانے سے پیدا کردی گئی ہے، آپنے ہماری اصلی خوشبو کی بنی ہوئی چیزوں پر فوقیت دی ہمارے عطریات اور روغن انگریزی خوشبویات سے پاک ہیں۔

مینیجر کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر حنا بلڈنگ لکھنو

خواتین کے لئے

عورتوں کے لئے افسانے ۸؍
تحفے اور دیگر افسانے ۸؍ خانم للعمر
نمبر یہ بیوی ۸؍ شام زندگی عمر
شب زندگی کے دو حصے عمر راہ گم ۸؍
شاہین دراج ۸؍ لاشوں کا شہر ۸؍
زملا ۸؍ یوسف نجمہ ۸؍ بنات النعش ۸؍
یاسمین ۸؍ آئینہ حرم ۸؍ نظمیں ۶؍ شمع
خاموش نظم ۶؍ آئینہ جمال ۱۲؍
بچوں کے لئے۔ ولایتی نمی ۶؍ دادا لال بجھکڑ ۸؍
بچوں کا الف ف ڈراما ۳؍

مینیجر کتبخانہ ادبی دنیا لاہور

